غالب اور شاہانِ تیموریہ

www.paknovels.com

خلیق انجم

شیخ غلام محمد اینڈ سنز
تاجران کتب
مائیسمہ بازار سری نگر کشمیر

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
نئی دہلی

www.paknovels.com

© خلیق انجم

صدر دفتر
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
جامعہ نگر نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

شاخ
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
اُردو بازار
دہلی ۱۱۰۰۰۶

شاخ
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
پرنسس بلڈنگ
بمبئی ۴۰۰۰۰۳

KASHMIR UNIVERSITY
Iqbal Library
Acc. No 182028
Dated 5.6.80
SH/83

شاخ
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
شمشاد مارکیٹ
علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

پہلی بار دسمبر ۱۹۷۴ء قیمت ۹/۵۰

کوہ نور پریس۔ دہلی

www.paknovels.com

فہرست

www.paknovels.com

www.paknovels.com

رفیقِ حیات

موہنی انجم

کے نام!

www.paknovels.com

پیش لفظ

اکبر شاہ ثانی، بہادر شاہ ظفر، تیموریہ شہزادوں اور خاص طور سے استادِ شہ محمد ابراہیم ذوق سے غالب کے تعلقات اُن کے سوانح کے چند واقعات ہی نہیں ہیں بلکہ ان کی زندگی کا وہ اہم حصّہ ہیں جس نے ان کی شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں نمایاں حصّہ لیا ہے اور جس کا ان کے فن پر واضح عکس نظر آتا ہے۔

غالب کو اپنی زندگی ہی میں غیر معمولی شہرت اور مقبولیت حاصل تھی۔ ادبی معرکوں سے قطع نظر ان کے علم و فضل اور شاعرانہ کمال کا غیر معمولی طور پر اعتراف کیا گیا۔ کسی ہمعصر شاعر کے اتنے شاگرد اور معتقد تمام ہندوستان میں پھیلے ہوئے نہیں تھے جتنے غالب کے تھے۔ پھر بھی انھیں یہ شکایت تھی کہ میں "یوسف بہ قیمت اول خریدہ ہوں" یا "میں عندلیبِ گلشنِ ناآفریدہ ہوں"۔ غالب کے ہاں اس بے قدری، بیزاری، مجبوری اور ناکامی کے خیالات کا اظہار محض شاعرانہ تعلّی کے نہیں بلکہ مخصوص حالات کے پس منظر میں حقیقت کے طور پر ہوا ہے جس کی ایک بڑی وجہ لال قلعہ ہے۔ لال قلعہ ادبی سرگرمیوں کا مرکز تھا۔ وہاں کا ادبی مذاق اور روایات ہی دلّی کے بیشتر شعرا اور اہلِ ذوق کے لیے قابلِ تقلید تھیں۔ اس ادبی ماحول میں غالب کی حیثیت ایک اجنبی کی تھی۔ غالب کو شدّت سے یہ احساس تھا کہ وہ اپنے عہد کے سب سے بڑے شاعر ہیں۔ اس لیے استادِ شہ اور درباری شاعر ہونے کا حق انھیں اور صرف انھیں حاصل ہے لیکن بعض واقعات اور قلعہ کے ادبی مذاق کی وجہ سے طویل عرصے تک ظفر کے دربار میں غالب کی رسائی نہ ہو سکی۔ اور یہ رسائی ہوئی بھی تو اس وقت جب "قویٰ مضمحل" ہو چکے تھے۔ اُردو غزل کو پہلی بار معنویت، فکر اور گیرائی دینے والے اس عظیم شاعر کو احساسِ تشنگی و ناکامی کی دولت کا بہت بڑا حصّہ اسی قلعے سے ملا تھا۔ غالب کا یہ کرب "ہوں میں کلامِ نغز، و لے ناشنیدہ ہوں" اُن کی شخصیت کا بہت اہم پہلو ہے۔ اسی کرب نے ان کے فن کو زمان و مکاں کی قیود سے اس طرح آزاد کیا ہے کہ ہر دور کا انسان اُس میں اپنی دل کی دھڑکنیں سُن سکتا ہے۔

اس مقالے میں ظفر اور ذوق سے غالب کے تعلقات گو تاریخی شواہد کی روشنی میں

www.paknovels.com

پیش کیا ہے۔ اُن فارسی اور اُردو اشعار کی نشان دہی کی گئی ہے جن میں غالب نے ظفر کو خطاب کرتے ہوئے اپنا اور ذوق کا موازنہ کرکے ذوقؔ کو خود سے کم تر ثابت کیا ہے اور بادشاہ سے اپنا جائز حق مانگا ہے۔ جواں بخت کے سہرے پر غالبؔ و ذوقؔ کا جو ادبی معرکہ ہوا تھا اس کی بنیاد محض شاعرانہ تعلّی پر نہیں تھی بلکہ اس کا سیاسی پس منظر تھا جس کی تفصیلات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

اُن تمام قصیدوں اور اشعار کی بھی نشان دہی کی گئی ہے جو اکبر شاہ ثانی، ظفر اور شہزادوں کی مدح میں غالب نے کہے تھے۔ خطوطِ غالب، دلّی اُردو اخبار، سراج الاخبار اور دوسرے ماخذ سے غالب کی اُن غزلوں کی فہرست بھی مرتب کی گئی ہے جو انھوں نے قلعے کے شاعروں کے لیے کہیں تھیں۔ غالب کے فن کو سمجھنے کے لیے یہ فہرست بہت اہم چیز ہے۔

غالب نے اُردو میں شاعری شروع کی تھی لیکن بہت جلد فارسی میں آگئے اور ساری زندگی اس پر فخر کرتے رہے کہ میرا اصل میدان فارسی ہے۔ غالب کے اس رویے کے وجوہ بھی تلاش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

۱۸۵۷ء کے انقلاب میں غالب کے رول اور پھر اُن کی تصنیف "دستنبو" کی روشنی میں غالب کی شخصیت کے بعض اہم پہلوؤں کا مطالعہ کیا گیا ہے۔

میں اس مقالے کے لیے اپنے کرم فرما مالک رام صاحب اور ڈاکٹر گیان چند جین اور اپنے دوست ڈاکٹر تنویر احمد علوی کا شکر گزار ہوں جنھوں نے مسودے پر نظر ثانی کرکے مفید مشورے دیے۔ مالک رام صاحب کے حکم اور اُن کی محبت کی وجہ ہی سے یہ مقالہ وجود میں آیا۔

اس کتاب کا دوسرا مقالہ 'اُردو مکتوب نگاری کا آغاز اور غالب' جشنِ غالب کے موقع پر لکھنا شروع کیا تھا۔ لیکن مکمل اب ہوا ہے۔ اس میں غالب کے عہد تک کی اُردو نثر اور مکتوب نگاری کا جائزہ لیا گیا ہے۔

www.paknovels.com

غالب اور شاہانِ تیموریہ

شاہانِ تیموریہ سے خاندانِ غالب کا تعلق خاصا قدیم تھا۔ بقولِ غالب ان کے دادا میرزا قوقان بیگ خاں اپنے والد سے ناراض ہو کر سمرقند سے مستقل طور پر ہندوستان آ گئے تھے۔ وہ پہلے لاہور میں نواب معین الملک (عرف میر منّو) کے ملازم ہوئے[1]؛ اور نواب کی وفات پر دہلی آ گئے۔ یہاں نواب ذوالفقار الدّولہ نے انھیں شاہ عالم کی سرکار میں پچاس گھوڑے، نقارہ اور نشان سے ملازم کرا دیا۔ ایک سیر حاصل پرگنہ ان کی ذات اور رسالے کی تنخواہ کے لیے مقرّر ہوا۔ کچھ ہی عرصے بعد میرزا قوقان بیگ خاں، شاہ عالم کی ملازمت ترک کر کے مہاراجہ جے پور کے ملازم ہو گئے اور غالباً اسی ملازمت کے دوران ان کا انتقال ہو گیا۔ غالب کے والد میرزا عبداللہ بیگ خاں نے لکھنؤ میں نواب آصف الدولہ حیدر آباد میں نواب نظام علی خاں اور الور میں راؤ راجہ بختاور سنگھ کی ملازمت کی، اور الور ہی میں کسی لڑائی میں مارے گئے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ غالب کے دادا میرزا

۱۔ غالب نے لکھا ہے کہ میرزا قوقان بیگ عہد شاہ عالم میں ہندوستان آئے تھے۔ اگر غالب کا یہ بیان درست ہے کہ وہ ہندوستان میں نواب معین الملک کے ملازم ہوئے تو یہ عہد محمد شاہ ہوگا، عہد شاہ عالم نہیں۔

www.paknovels.com

ترقان بیگ خاں کے بعد مغل حکومت سے اس خاندان کا براہِ راست کوئی تعلق نہیں رہا۔

غالب نے ایک شاعر کی حیثیت سے اکبر شاہ ثانی کے دربار میں رسائی حاصل کی۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ غالب کے چچا نصر اللہ بیگ خاں کی شادی فخر الدولہ دلاور الملک نواب احمد بخش خاں بہادر رستم جنگ والیِ لوہارو کی بہن سے ہوئی تھی۔ پھر ۱۲۲۵ھ میں نواب احمد بخش خاں کے چھوٹے بھائی نواب الٰہی بخش خاں معروف کی بیٹی امراؤ بیگم سے غالب کی شادی ہوگئی؛ اور دو تین سال بعد غالب نے دلّی میں مستقل سکونت اختیار کرلی۔ دربار شاہی سے غالب کے تعلق کی اولین شہادت وہ قصیدہ ہے جو انھوں نے اکبر شاہ ثانی کی مدح میں کہا تھا۔ قصیدے کا مطلع ہے:

دریں زمانہ کہ کلکِ رصد نگار حکیم
ہزار و دو صد و پنجاہ راند در تقویم[۱]

گویا غالب نے ۱۲۵۰ھ (۱۸۳۴ء) میں یہ قصیدہ کہا تھا۔ اُس وقت اُن کی عمر لگ بھگ ۳۷ سال کی تھی۔ سوال یہ ہے کہ دربارِ شاہی میں غالب کی رسائی کیسے ہوئی؟ نواب احمد بخش خاں کا اکتوبر ۱۸۲۷ء میں انتقال ہوا۔ اگر ان کی وساطت سے یہ رسائی ہوئی ہوتی، تو کلیات غالب میں اکبر شاہ ثانی کی مدح میں صرف یہی ایک قصیدہ نہ ہوتا کچھ اور بھی ہوتے۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ ۳۷ سال کی عمر میں دنیائے ادب میں غالب اپنا اچھا خاصا مقام بنا چکے تھے۔ اس لیے عین ممکن ہے کہ انھوں نے خود ہی بادشاہ کے دربار میں رسائی حاصل کی ہو۔ اکبر شاہ ثانی کی مدح کا یہ قصیدہ اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ غالب کی بعد کی زندگی پر اس کا بہت گہرا اثر پڑا۔ اس قصیدے میں غالب نے اکبر شاہ کی تعریف کے بعد اخیر میں شہزادہ سلیم کی مدح سرائی

۱۔ آفاق حسین آفاق نے اس قصیدے کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ قصیدہ مارچ ۱۸۳۵ء کی تصنیف ہے۔ لیکن انھوں نے کوئی حوالہ نہیں دیا۔

(نادراتِ غالب، ص ۸۶)

www.paknovels.com

بھی کی ہے۔ اکبر شاہ ثانی کے گیارہ بیٹے تھے[۱]۔ ان میں بہادر شاہ ظفر سب سے بڑے تھے۔ عام قاعدے کے مطابق انھیں ولی عہد مقرر ہونا چاہیے تھا۔ لیکن اکبر شاہ ثانی ان کے بجائے اپنے تیسرے بیٹے میرزا جہانگیر کو ولی عہد مقرر کرنا چاہتے تھے۔ جب ۳۱ سال کی عمر میں ۱۸۲۱ء میں میرزا جہانگیر کا انتقال ہو گیا[۲]، تو اب بادشاہ نے چوتھے بیٹے میرزا سلیم کے لیے کوشش شروع کر دی۔ ولی عہدی کے اس جھگڑے نے قلعہ میں اچھا خاصا ہنگامہ برپا کر رکھا تھا۔ اکبر شاہ ثانی مستقل کوشش کر رہے تھے کہ بہادر شاہ کو اُن کے حق سے محروم کر دیا جائے۔ اس سلسلے میں انھوں نے ظفر پر یہ الزام لگایا کہ شاہ عالم کے زمانے میں ظفر نے بادشاہ کی ایک بیگم کی عصمت دری کی تھی[۳]۔ بقول اسپیئر کم سے کم دو بار میرزا جہانگیر نے بہادر شاہ (ظفر) کو زہر دے کر مارنے کی کوشش کی تھی[۴]۔ جب اکبر شاہ ثانی میرزا سلیم کو ولی عہد بنانے کی کوشش کر رہے تھے، تو غالب کو ضرور یہ خیال ہوا ہوگا کہ آخر ہوگا وہی جو بادشاہ چاہتے ہیں، یعنی میرزا سلیم ولی عہد اور پھر بادشاہ بنیں گے۔ اسی خیال کے تحت انھوں نے قصیدے میں نہ صرف شہزادہ سلیم کی تعریف کی، بلکہ یہ ثابت کیا کہ ان کی تربیت اس انداز سے کی گئی ہے کہ مغل تخت و تاج کے وارث ہونے کا حق صرف انھیں کو پہنچتا ہے۔ اس کا بھی امکان ہے کہ اکبر شاہ یا شہزادہ سلیم نے خود فرمائش کر کے یہ قصیدہ لکھوایا ہو تاکہ انگریزوں کی رائے کو متاثر کیا جا سکے۔ اس قصیدے کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔[۵]

ستایشِ شہ و شہزادہ می کنم آہنگ
بسازِ حسنِ ادب، در مقامِ ذوقِ سلیم

۱۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: قلعۂ معلیٰ کی جھلکیاں، ص ۳۲

۲۔ TWILIGHT OF MUGHALS, P. 73-75

۳۔ P. SPEARES: TWILIGHT OF THE MUGHALS. P.7

۴۔ ایضاً P.71

www.paknovels.com

ولے چنانکہ رہ و رسمِ بختہ گویانست
کہ نکتہ را بمحل جا دہند، در تقسیم
ز شاہزادہ نخست آوردم سخن کہ بباغ
شگوفہ را بہ ثمر در نمو، بود تقدیم

مطلع

زہے مناسبتِ طبعِ شاہزادہ سلیم
بفیضِ تربیتِ پادشاہِ ہفت اقلیم
نہ مہر و ماہ، و لیکن چو مہر و ماہِ منیر
نہ ابر و بحر، و لیکن چو ابر و بحرِ فخیم
ہمش بہ بارگہ ناز، زہرہ خنیاگر
ہمش در انجمنِ راز، تیر چرخ ندیم
ستودہ ایست بنازش بپادشاہ انیس
ستارہ ایست بتابش؛ بآفتاب سہیم
خدایگانِ سلاطین محمد اکبر شاہ
نہ کردگار، و لیکن چو کردگار کریم
خلیفۂ حق و صاحبقرانِ روی زمیں
بدیں مباہی و در دہر واجب التعظیم

یہ ممکن نہیں کہ اس قصیدے سے بہادر شاہ کبیدہ خاطر نہ ہوئے ہوں۔ غالب نے یہ قصیدہ ۱۸۳۴ء میں پیش کیا اور تھوڑے ہی دن بعد انگریزوں نے بہادر شاہ کو ولی عہد مقرر کر دیا۔ ۲۸ ستمبر ۱۸۳۷ء کو اکبر شاہ ثانی کا انتقال ہوا۔ اور دوسرے ہی دن بہادر شاہ کی تخت نشینی کی رسم ادا ہوئی۔ غالب نے میرزا سلیم کی مدح کر کے جو غلطی کی تھی، اس کی سزا انھیں کافی عرصے تک ملی۔ غالب کے ساتھ ظفر کا جو رویہ رہا تھا، اس کا صحیح اندازہ ذوق اور غالب کے تعلقات کی روشنی میں کیا جا سکتا ہے۔

www.paknovels.com

ذوقؔ اور غالبؔ

ذوقؔ عمر میں غالب سے تقریباً آٹھ سال بڑے تھے[1]۔ جب غالبؔ نے ۱۲۲۶ھ (۱۸۱۲-۱۳-۱۸۱۳ء) میں دلّی میں مستقل سکونت اختیار کی، تو ان کی عمر لگ بھگ پندرہ سال تھی[2]۔ دلّی آنے سے چار پانچ سال پہلے سے وہ شعر کہہ رہے تھے[3]۔ گویا جب وہ دلّی پہنچے ہیں، تو ان کا ادبی شعور خاصا پختہ تھا۔ حکیم ثناء اللہ خاں فراقؔ، حافظ عبدالرحمٰن خاں احسانؔ، میر قمرالدین منتؔ، مرزا عظیم بیگ عظیمؔ، میر نظام الدین ممنونؔ، حکیم قدرت اللہ قاسمؔ وغیرہ اکبر شاہ ثانی کی بزمِ سخن کی رونق تھے۔ بہادر شاہ ظفر کو شعر و سخن سے اپنے والد سے کہیں زیادہ دلچسپی تھی۔ وہ نہ صرف شاعروں کی سرپرستی کرتے تھے بلکہ خود بھی شاعر تھے؛ ۱۲۲۴ھ میں اُن کا دیوان شائع ہو چکا تھا[4]۔ انھیں شاہ نصیرؔ، عزت اللہ عشقؔ اور میر کاظم حسین بیقرارؔ سے تلمذ رہ چکا تھا[5]۔ غالباً ۱۲۲۳ھ کے لگ بھگ ذوقؔ کی رسائی بہادر شاہ ظفرؔ تک ہوئی[6]۔

۱۔ محمد حسین آزاد نے دیوانِ ذوق میں ذوقؔ کی تاریخِ ولادت ۱۱ ذوالحجہ ۱۲۰۴ھ اور آبِ حیات میں صرف ۱۲۰۴ھ لکھی ہے (دیوانِ ذوق: ۲۔ آبِ حیات: ۵۲۰) ذوق کی وفات کی اطلاع دیتے ہوئے سلطان الاخبار (کلکتہ) نے ان کا سنہ ولادت بھی دیا ہے۔ اخبار مذکور لکھتا ہے "ولادتِ شیخ در یکہزار و دو صد و سہ سال ہجری واقع گشت"۔ بحوالہ عابد رضا بیدار، نوائے ادب، جولائی ۱۹۵۸ء، ص ۴۵

غالب کی تاریخِ ولادت ۸ رجب ۱۲۱۲ھ (۲۷ دسمبر ۱۸۹۷ء) ہے۔ (ذکرِ غالب: ۲۳)

۲۔ ذکرِ غالب، ص ۴۵

۳۔ کلیاتِ فارسی کے آخر میں غالب کی لکھی ہوئی تقریظ شامل ہے جس میں غالب لکھتے ہیں: "از روزی کہ شمارۂ سنینِ عمر از آحاد فراتر رفت در شتہ حساب زحمتِ یازدہمین گرہ بخود برگرفت۔ اندیشہ در روا روِ گامِ فراخ برداشت دگر یوہ و مغاکِ بادیۂ سخن پیمودن آغاز نہاد"۔ (کلیات: ۵۵۳-۵۵۴)

۴۔ ظفر کا یہ دیوان اول مطبعِ سلطانی، قلعۂ معلّی میں چھپا تھا۔ اس کا ایک نسخہ رضا لائبریری، رامپور میں محفوظ ہے۔

۵۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو۔ بہادر شاہ ظفر۔ تحقیقی مقالہ، ص ۳۰۸-۳۱۶

۶۔ سلطان الاخبار نے ذوق کی وفات سے متعلق اطلاع دیتے ہوئے یہ بھی لکھا ہے: "ہر گاہ کہ شیخ (ذوق) نوزدہ سالہ شدہ در عالمِ ولی عہدی خدیوِ دہلی باریابِ حضورِ اقدس گردید"۔ بحوالہ نوائے ادب (جولائی ۱۹۵۸ء)، ص ۴۴

www.paknovels.com

بہر حال، یہ یقینی ہے کہ ذوق ۱۲۲۵ھ سے قبل قلعۂ معلّیٰ کے متوسل ہو چکے تھے۔ کیوں کہ شہزادہ جہانگیر کی شادی پر انھوں نے قصیدۂ تہنیت پیش کیا تھا۔ جس میں یہ شعر بھی شامل تھا:

کہو سرِ لبِ بستہ سے شادیِ فرزند
مبارک آپ کو ہو، اے شہِ سپہر وقار!

۱۱۹۳ + ۳۲ = ۱۲۲۵ھ

گویا غالب کے دلّی آنے سے قبل ہی ذوق کو بہادر شاہ ظفر کے استاد ہونے کا شرف حاصل ہو چکا تھا۔ یا کم از کم وہ ظفر کے مقربوں میں شمار ہونے لگے تھے۔ غالب جیسے کم عمر لڑکے کی اکبر شاہ ثانی کے دربار میں رسائی آسان نہیں تھی۔ وہاں بڑے بڑے اساتذۂ فن موجود تھے۔ اس لیے غالب نے بہادر شاہ ظفر کے ہاں باریاب ہونے کی جد و جہد کی ہوگی۔ ظفر پر ذوق کا اثر تھا ہی؛ غالب کی مخصوص افتادِ طبع اور مزاجِ شعری دونوں ان کے راستے میں رکاوٹ بنے ہوں گے۔ ابتدا میں کلامِ غالب شہر اور قلعہ دونوں جگہ بہت زیادہ مقبول نہیں تھا۔ اس کے علاوہ ایک سیاسی وجہ بھی ہو سکتی ہے۔ غالب کے چچا نصر اللہ بیگ خاں نے ۱۸۰۳ء میں آگرے کا قلعہ لارڈ لیک کے حوالے کر دیا تھا۔ انگریزوں کی طرف سے نصر اللہ بیگ کی وفات کے بعد ان کے وارثوں میں جن لوگوں کو پنشن ملتی تھی، اُن میں غالب بھی تھے۔ انھیں مغل حکومت نے نہیں، مرہٹوں نے صوبہ دار مقرر کیا تھا۔ لیکن ایک ضعیف سا امکان اس کا بھی ہے کہ قلعے میں اس بنیاد پر بھی غالب کی مخالفت ہوئی ہو۔ بہر حال وجہ کچھ بھی رہی ہو، حقیقت یہ ہے کہ ظفر کے دربار میں غالب کی رسائی نہیں ہوئی۔ غالب اپنے آپ کو ذوق کے مقابلے میں بڑا شاعر سمجھتے تھے، اور یہ حقیقت بھی ہے۔ مگر غالب کی شاعری اپنے عہد سے زیادہ آنے والے عہد کی شاعری تھی۔ غالب کا خیال بالکل درست تھا:

میں عندلیبِ گلشنِ نا آفریدہ ہوں

اُردو میں یہ روایت تو رہی ہے کہ کسی شاعر نے ابتدا فارسی سے کی، لیکن بعد کو

www.paknovels.com

اُردو میں شعر کہنے لگا۔ لیکن غالب اور اقبال کے علاوہ شاید ہی کوئی مثال ملے کہ اُردو میں شعر کہنے والا فارسی میں چلا گیا ہو۔ (اگرچہ غالب کے ابتدائی عہد کی ایک فارسی غزل کا سراغ بھی ملتا ہے۔ لیکن آغاز میں ان کی بیشتر توجہ اُردو ہی کی طرف تھی) اقبال نے فارسی گوئی اس لیے اختیار کی تھی کہ وہ سیاسی افکار کے لیے مسلمانوں کے ایک بڑے حلقے کو مخاطب بنانا چاہتے تھے۔ اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ غالب فارسی زبان کے مزاج شناس تھے۔ انھیں فارسی پر پوری قدرت حاصل تھی۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ اس تبدیلی کی وجہ اس عہد میں غالب کی نامقبولیت اور خاص طور سے قلعۂ معلیٰ میں ذوق کی عزّت افزائی تھی۔

قصائدِ ذوق مرتبہ سر شاہ سلیمان میں دس ایسے قصیدے شامل ہیں جو ذوق نے اکبر شاہ ثانی کی مدح میں کہے تھے؛ یہ سب قصیدے اُردو میں ہیں۔ اس کے برعکس غالب نے اکبر شاہ ثانی کی مدح میں جو قصیدہ کہا تھا، وہ فارسی میں ہے۔ عین ممکن ہے کہ غالب بتانا چاہتے ہوں کہ ان کا اصلی میدان فارسی میں ہے نہ کہ اُردو میں۔ اس لیے انھیں اپنے معاصرین پر فوقیت حاصل ہے۔

ذوق کو خاقانیِ ہند کا خطاب اکبر شاہ ثانی نے دیا تھا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ ذوق نے جو قصیدہ شاہزادہ سلیم کی شادی کے موقع پر لکھ کر اکبر شاہ ثانی کے سامنے پیش کیا تھا۔ اس میں یہ شعر بھی تھا:

مدح حاضر کے لیے حاضرِ دربار ہو ذوق
تو ہے خاقانیِ ہند، اور وہ ہے خاقانِ زماں[1]

یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہنا تو بہت مشکل ہے۔ لیکن امکانِ قوی یہ ہے کہ غالب کو اُردو سے برگشتہ کرنے میں اس خطاب کو بھی اچھا خاصا دخل تھا۔

۱۔ اس کا ثبوت یہ بھی ہے کہ گلشنِ بیخار میں اس خطاب کا ذکر ہے۔ اور گلشنِ بیخار اکبر شاہ ثانی کی زندگی میں (۱۸۳۵ء) لکھا گیا تھا۔

www.paknovels.com

کچھ عرصے بعد غالب اس پر فخر کرنے لگے کہ ان کا اصل میدان فارسی ہے۔ انھوں نے ایک فارسی قطعے میں اپنی فارسی گوئی پر فخر کرتے ہوئے غالباً ذوق پر چوٹ کی ہے[1]۔ ۱۹۔ اشعار کے اس قطعے میں ذوق کو جواب دیتے ہوئے کہتے ہیں :

اے کہ در بزمِ شہنشاہِ سخن رس گفتۂ
کے بہ پر گوئی فلاں در شعر ہمسنگِ منست

راست گفتی، لیک میدانی کہ نبود جائے طعن
کمتر از بانگِ دہل گر نغمۂ چنگِ منست

نیست نقصان، یکدو جزو ست ار سوادِ ریختہ
کان دژم برگے ز نخلستانِ فرہنگِ منست

فارسی بیں، تا بہ بینی نقشہای رنگ رنگ
بگزر از مجموعۂ اردو کہ بیرنگِ منست

فارسی بیں تا بدانی کاندر اقلیمِ خیال
مانی وارژنگم وآں نسخہ ارتنگِ منست

کے درخشد جوہرِ آیینہ تا باقیست زنگ
صیقلی آیینہ ام ایں جوہر آں زنگِ منست

ہاں، من ویزداں بنائے شکوہ برمہر و وفاست
تا نہ پنداری بپرخاشِ تو آہنگِ منست

دوست بودی، شکوہ سر کردم، ولے جرمِ تو نیست
کایں ہمہ بیداد بر من از دلِ تنگِ منست

۱- قاضی عبدالودود صاحب نے اس قطعے کے بارے میں لکھا ہے کہ "قیاس ہے کہ اس میں ذوق سے خطاب ہے۔ یہ بہت قرینِ قیاس ہے۔ لیکن کوئی روایت جو اس کی مصدق ہو، اب تک نہیں ملی (بین الاقوامی غالب سیمنار، مرتبہ ڈاکٹر یوسف حسین خاں، ص ص ۴۹ - ۵۰)۔ آبِ حیات میں بھی یہی ہے۔

www.paknovels.com

بختِ من ناسازو خوے دوست زاں ناساز تر
تا چہ پیش آید کنوں با بختِ خود جنگِ منست

دشمنی راہمفنی شرط است و آں دانی کہ نیست
از تو نبود نغمہ در سازی کہ در چنگِ منست

در سخن چوں ہمزبان و ہمنوا ے من نۂ
چوں دلت را پیچ و تاب از رشکِ آہنگِ منست؟

راست میگویم من واز راست سر نتواں کشید
ہر چہ در گفتار فخرِ تست، آں ننگِ منست

میفرستم، تا نظر گاہِ جہاندار، ایں ورق
نامہ بر بادا اگر خود طائرِ رنگِ منست

دیدہ ور سلطاں سراج الدین بہادر شہ کہ اُو
آں شرر بیند کہ پنہاں در رگِ سنگِ منست

جم حشم شاہی کہ در ہنگامۂ عرضِ سپاہ
میتواند گفت دارا را کہ سرہنگِ منست

انوری و عرفی و خاقانی سلطاں منم
بادشہ، طہمورث و جمشید و ہوشنگِ منست

شاہ میداند کہ من مدّاحِ شاہم، باک نیست
گر تو اندیشی کہ ایں دستان و نیرنگِ منست

از ادب دورم زخاقان، ورنہ در اظہارِ قرب
خطوہ دگامِ تو، گویی، میل و فرسنگِ منست

مقطعِ ایں قطعہ زیں مصرع مصرّع باد و بس
"ہر چہ در گفتار فخرِ تست، آں ننگِ منست"

غالب کی مشکل یہ ہے کہ وہ ایک عظیم فنکار ہیں لیکن اس پایے کے فنکار کا جو

www.paknovels.com

رویّہ زندگی کی طرف ہونا چاہیے، وہ اس سے محروم ہیں۔ عام طور پر عظیم فنکار "شوق ہر رنگ رقیبِ سروساماں نکلا"، کی مجسم تفسیر ہوتا ہے۔ وہ فن کو خونِ جگر سے سینچتا ہے، اور ایسا کرنے کے لیے اسے تمام مادّی ضرورتوں اور آسائشوں سے بے نیاز ہونا پڑتا ہے۔ غالب کا المیہ یہ ہے کہ ایک طرف ان کا آدرش عظیم فن کی تخلیق ہے، لیکن دوسری طرف ذوق کا سماجی وقار بھی اُن کے لیے ناقابلِ برداشت ہے۔ غالب بخوبی واقف تھے کہ ان کا فن ذوق اور ظفر دونوں کے فہم وادراک سے بلند تر ہے لیکن بادشاہ سے قربت حاصل کرنے کی تمنّا نے انھیں زندگی بھر انگاروں پر لوٹایا۔ اس قطعے میں غالب اپنی شاعری کو نغمۂ چنگ اور ذوق کے فن کو بانگِ دہل کے مماثل کہتے ہیں۔ وہ اس پر ناز کرتے ہیں کہ اُن کا اصلی میدان اُردو نہیں، فارسی ہے؛ بلکہ وہ اپنی اُردو شاعری کو آیینے پر لگے ہوئے زنگ سے تشبیہہ دیتے ہیں۔ غالب کہتے ہیں، جس اُردو شاعری پر تم کو ناز ہے، وہ میرے لیے تو باعثِ شرم ہے۔ اسی ضمن میں وہ بہادر شاہ کی مدح کرتے ہوئے یہ بھی کہتے ہیں کہ میں انوری، عرفی اور خاقانی ہوں۔ گویا اکبر شاہ ثانی کے دربار سے ذوق کو جو خاقانیِ ہند کا خطاب ملا تھا، غالب کے خیال میں اس کے اصلی حقدار ذوق نہیں، غالب تھے۔ اس قطعے سے ایک اور اہم بات کا پتا چلتا ہے کہ ذوق نے غالب کے خلاف بادشاہ کے کان بھرے تھے، ممکن ہے انھوں نے دوسرے موقعوں پر بھی یہ کیا ہو۔ اسی لیے غالب کو کہنا پڑا کہ بادشاہ جانتے ہیں کہ میں اُن کا مدّاح ہوں؛ اگر تم اسے میرے فریب پر محمول کرو تو کیا ہے۔ اسی قطعے میں غالب نے وہ بات بھی کہہ دی، جس نے زندگی بھر انھیں چین سے نہیں بیٹھنے دیا۔ وہ ذوق سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ تمھارا کوئی قصور نہیں، تصور تو میرے دل تنگ کا ہے جو مجھ پر ظلم ڈھاتا ہے۔ کیا کروں میری قسمت ناساز گار ہے اور خوے دوست (یعنی بہادر شاہ ظفر) اور بھی زیادہ ناساز گار.... اس قطعے میں غالب کی شخصیت کا پورا تضاد ابھر کر سامنے آگیا ہے۔ تماشاے اہل کرم دیکھنے کے لیے انھیں طرح طرح کے بھیس بدلنا پڑے، کے ہاتھوں ارمان پورے ہوئے، لیکن سیری نہ

Kashmir University
Iqbal Library
Acc. No ...
www.paknovels.com

ہو سکی۔ غالب اکثر ذوق دشمنی میں یہ بھول جاتے تھے کہ ذوق کو استادِ شہ ہونے کا شرف حاصل ہے۔ ان کی اردو شاعری کا مذاق اڑانے کا مطلب ظفر کی شاعری کا مذاق اڑانا ہے۔ انھیں جاہل بتانا خود بادشاہ کو جاہل ثابت کرنے کے مترادف ہے۔ ظاہر ہے کہ غالب کے اس قسم کے اشعار سے ظفر اور بھی کبیدہ خاطر ہوتے ہوں گے۔

غالب کو جب بھی کوئی موقع ہاتھ آیا، انھوں نے ذوق کو کمتر ثابت کرنے میں کسر نہیں اٹھا رکھی۔ ایک طویل قصیدے کے چند اشعار میں کسی شاعر سے اپنا مقابلہ ان الفاظ میں کیا ہے:

بالد بخویش خواجہ، چو گوئی سخنورش
غافل کہ ایں ترانہ، بہ بہتاں برابر است
نے ہر ترانہ سنج، بگیا نوا بود
نے ہر سخن سرای، بہ سحباں برابر است
نے ہر شتر سوار، بہ صالح بود ہمال
نے ہر شبان، بموسیِ عمراں برابر است
نے ہر کہ گنج یافت، ز پرویز گوی برد
نے ہر کہ باغ ساخت، برضواں برابر است
گفتی کہ این و آن بود از نطق مایہ ور
دین در شمارِ شیوہ نہ با آں برابر است
گیرم کہ ہر گیا برد از ابر و باد فیض
خر زہرہ کے بسنبل و ریحاں برابر است
امروز من نظامی و خاقانیم بدہر
دہلی ز من بہ گنجہ و شروان برابر است

ان اشعار میں غالب نے کہیں ذوق کا نام نہیں لیا، لیکن ظفر کو مخاطب

www.paknovels.com

کرکے اگر غالب کسی اور سخنور سے مقابلہ کریں، تو وہ ذوق کے سوائے اور کون ہو سکتا ہے؟ غالب کہتے ہیں، جب لوگ خواجہ (ذوق) سے اس کی شاعری کی تعریف کرتے ہیں، تو وہ خوشی سے پھولا نہیں سماتا اور نہیں جانتا کہ اس کی یہ تعریف نہیں بلکہ اس پر بہتان باندھا جا رہا ہے۔

ان اشعار میں بھی غالب نے طرح طرح کی تشبیہوں کے پردے میں چھ شعروں میں صرف اتنی بات کہی ہے کہ فن میں ذوق کا مرتبہ مجھ سے کم ہے۔ آخر میں پھر وہی بات دہرائی ہے جو وہ پہلے کہہ چکے ہیں کہ ذوق اگر خاقانیِ ہند ہیں، تو کیا؛ میں تو خاقانیِ دہر ہوں۔ ظاہر ہے کہ ان اشعار کا اثر ذوق کے استاد ظفر پر اچھا نہیں ہوا ہوگا۔

غالب اور ذوق میں سہرے کے معرکے کے سوائے براہِ راست کبھی کوئی چپقلش نہیں ہوئی۔ البتہ دونوں غزل کی رمزیت کا سہارا لے کر ایک دوسرے پر چوٹیں ضرور کرتے رہے۔ مثلاً ذوق کی پوری شاعری میر کی داخلیت کی نفی کرتی ہے۔ اس پس منظر میں غالب کا یہ شعر ملاحظہ ہو:

غالب! اپنا یہ عقیدہ ہے بقولِ ناسخ
"آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میر نہیں"

ظاہر ہے غالب نے ناسخ کے مصرع کو بے وجہ تضمین نہیں کیا۔ ذوق جواب دیتے ہیں:

نہ ہوا پر نہ ہوا، میر کا انداز نصیب
ذوق! یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

اب غالب کی ایک مشہور غزل کے بارے میں چند گزارشات ملاحظہ ہوں:

غالب ۴ جولائی ۱۸۵۰ء کو خاندانِ مغلیہ کی تاریخ لکھنے پر مقرر ہوئے۔ اس سے تھوڑی مدت بعد انھوں نے ایک غزل کہی، جس کے کچھ اشعار یہ بھی ہیں:

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ، تو کیا ہے؟
تمھیں کہو کہ، یہ اندازِ گفتگو کیا ہے؟

www.paknovels.com

نہ شعلے میں یہ کرشمہ، نہ برق میں یہ ادا
کوئی بتاؤ کہ، وہ شوخِ تند خو کیا ہے؟
یہ رشک ہے کہ، وہ ہوتا ہے ہم سخن تم سے
وگرنہ خوفِ بدآموزیِ عدو کیا ہے؟
رگوں میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا، تو پھر لہو کیا ہے؟
رہی نہ طاقتِ گفتار، اور اگر ہو بھی
تو کس امید پہ کہیے کہ، آرزو کیا ہے؟
بنا ہے شہ کا مصاحب، پھرے ہے اتراتا
وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے؟

ابھی تک کسی نقّاد اور محقق کی نظر اس طرف نہیں گئی کہ ان چھ اشعار میں غالب نے ظفر اور ذوق سے اپنے تعلقات کی پوری داستان بیان کی ہے۔ یہاں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ یہ غزل دیوانِ غالب کے پہلے اور دوسرے اڈیشن (۱۸۴۱ء اور ۱۸۴۷ء) میں شامل نہیں۔ اور پھر غالب کے لیے اس مفہوم کا مقطع اس وقت تک کہنا ممکن نہیں تھا جب تک کہ وہ خود ظفر کے ملازم نہ ہوئے ہوتے۔ کیونکہ بادشاہ کے استاد پر اتنی کھلی چوٹ غالب کے لیے ممکن نہیں تھی۔ پھر اپریل ۱۸۵۲ء میں سہرے والا واقعہ پیش آیا جس کی تفصیل آگے آئے گی۔ اس کے بعد تو ایسی غزل کہنا کسی طرح ممکن نہ تھا۔ اس لیے میرا قیاس ہے کہ یہ غزل جولائی ۱۸۵۰ء (جب غالب قلعے میں ملازم ہوئے) اور اپریل ۱۸۵۲ء (سہرے کی تاریخ) کے درمیانی زمانے میں لکھی گئی۔ غزل کے مطلعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالب، ظفر کے رویے کی شکایت کر رہے ہیں۔ دوسرے شعر میں ظفر کی زود رنج طبیعت کی طرف اشارہ ہے جیسا کہ غالب اور ظفر کے تعلقات کے سلسلے میں بیان کیا جا چکا ہے، ظفر عہدِ شاہزادگی ہی سے ناراض تھے۔ تیسرے شعر میں ذوق اور ظفر کے تعلقات پر بڑی چابک دستی سے چوٹ کی گئی ہے۔ چوتھے

www.paknovels.com

شعر میں غالب نے کلامِ ذوق پر جن مختصر سے الفاظ میں تنقید کی ہے، شاید اس سے بہتر تنقید ممکن نہیں۔ پانچویں شعر میں غالب نے اپنی مجبوری اور بے بسی کا ذکر کیا ہے۔ اور مقطعے میں تو ذوق پر کھلی چوٹ ہے ہی۔ غالب کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اگر وہ مقطعے میں اپنے کسی ممدوح کا ذکر کرتے ہیں تو کبھی تو پوری غزل اور کبھی چند اشعار میں غزل کے رمزی امکانات سے پورا فائدہ اُٹھاتے ہوئے ممدوح سے خطاب کرتے ہیں۔ اس غزل میں غالب نے جو کچھ کہا ہے، ممکن نہیں کہ ظفر نے اسے محسوس نہ کر لیا ہو۔ اس کا ثبوت وہ مشہور معرکہ ہے، جو سہرے کے سلسلے میں ہوا۔

جواں بخت کا سہرا

زینت محل کے صاحبزادے جواں بخت کی منگنی مئی ۱۸۵۱ء میں ہوئی اور برات و وداعِ عروس اپریل ۱۸۵۲ء میں عمل میں آئی[۱]۔ غالب نے زینت محل کے ایما پر اس تقریب پر اپنا مشہور سہرا کہا۔ جس کا مقطع ہے:

ہم سخن فہم ہیں، غالب کے طرفدار نہیں
دیکھیں، اس سہرے سے کہہ دے کوئی بہتر سہرا

اس قطعے میں بظاہر محض شاعرانہ تعلّی ہے، جو اکثر شعرا کے کلام میں ملتی ہے۔ اس

۱۔ ۲۵ مئی ۱۸۵۱ء کو دہلی اُردو اخبار (جلد ۱۳۔ شمارہ ۲۱) اطلاع دیتا ہے "نسبتِ شاہی اس مضمون کا آیا کہ نسبتِ ازدواج مرزا محمد جواں بخت بہادر کی صبیۂ محمد خان پسرِ نواب احمد قلی خان بہادر سے قرار پائی ہے۔" ۱۱ اپریل ۱۸۵۲ء کو دہلی اُردو اخبار (جلد ۱۴) نے خبر دی کہ "باجملہ ۳۱ مارچ کو خانہ بندی اور یکم ماہِ حال (اپریل) کو برات اور دوسری کو وداعِ عروس، جہیز وغیرہ از طرفِ ولی داد خان بہادر بھی زائد از متخیلۂ خاص و عام نمایاں ہوا۔"
(اس کتاب میں دہلی اُردو اخبار کے تمام اقتباسات مولانا امتیاز علی عرشی کے مقالے مطبوعہ نوائے ادب جولائی ۱۹۵۰ء سے لیے گئے ہیں۔ خ۔ا)

www.paknovels.com

حیثیت سے اس میں کوئی قابلِ اعتراض بات نہیں تھی۔ لیکن ظفر اور ان کے مقرّبوں کے ذہن میں غالب کے یہ اشعار بھی تھے، جو وہ وقتاً فوقتاً کہتے رہے تھے:

راست میگویم من و از راست سر نتواں کشید
ہر چہ در گفتار فخرِ تست، آں ننگِ من است

گیرم کہ ہر گیاہ بردا ز ابر و باد فیض
خر زہرہ کے بہ سنبل و ریحاں برابر است

امروز من نظامی و خاقانیم بدہر
دہلی زمن بہ گنجہ و شروان برابر است

یہ رشک ہے کہ وہ ہوتا ہے ہم سخن تم سے
وگرنہ خوفِ بد آموزیِ عدو کیا ہے؟

بنا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا
وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے؟

ظاہر ہے کہ ان تمام اشعار میں ذوق پر چوٹ کی گئی ہے اور آخری دو شعروں کا واقعہ تو ابھی تازہ ہی تھا۔ اس لیے ظفر بھڑک گئے۔ انھوں نے ذوق سے اس شاعرانہ تعلّی کا جواب دینے کی فرمائش کی۔ یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ غالب نے یہ سہرا نواب زینت محل کی فرمایش پر لکھا تھا۔ اس کی تفصیل آگے بیان کی گئی ہے۔ نواب زینت محل کا الگ گھر بنوا کر قلعے سے دور رہنا یہ ثابت کرتا ہے کہ قلعے میں زینت محل کے دشمنوں کی تعداد اچھی خاصی تھی۔ وجہ ظاہر ہے! بہادر شاہ ظفر زینت محل سے بہت محبت کرتے تھے اسی کا نتیجہ تھا کہ زینت محل اپنے اکلوتے بیٹے جوان بخت کو ولیعہد بنانے کے خواب دیکھ رہی تھیں۔ حکیم احسن اللہ خان کے زینت محل سے بہت اچھے تعلقات تھے اور غالب حکیم صاحب کے بہت بڑے مدّاح تھے جس کی تصدیق غالب کی متعدد تحریروں سے ہوتی ہے۔ ان حالات کے پیشِ نظر یا تو غالب قلعے کی سیاست میں عملی طور پر حصہ لے رہے تھے، یا کم از کم ان کے بارے میں عام خیال یہی تھا۔ اس سہرے کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ قلعے

www.paknovels.com

میں استاد ذوق کے ہوتے ہوئے زینت محل نے سہرے کی فرمائش صرف غالب سے کی[1]۔ محمد حسین آزاد لکھتے ہیں:

"نواب زینت محل کو بادشاہ کے مزاج میں بہت دخل تھا۔ مرزا جواں بخت ان کے بیٹے تھے اور باوجودیکہ بہت مرشد زادوں سے چھوٹے تھے، مگر بیگم کی خاطر سے ان کی ولیعہدی کے لیے کوشش کر رہے تھے۔ ان کی شادی کا موقع آیا۔ بڑی دھوم دھام کے سامان ہوئے۔ بیگم کی ایما سے غالب مرحوم نے یہ سہرا کہہ کر، زرنگار کاغذ پر لکھ کر، ایک سونے کی کشتی میں رکھ کر بڑے تکلف کے ساتھ حضور میں گزرانا۔"[2]

ظاہر ہے کہ یہ بات ذوق کے مداحین کو بہت ناگوار گذری ہوگی اور انھوں نے ظفر کے کان بھرے ہوں گے۔ مقطع میں جو چوٹ کی گئی تھی، وہ یوں بھی ظفر کو کھٹکی ہوگی محمد حسین آزاد نے ظفر کی برہمی کا حال اپنے مخصوص انداز میں اس طرح بیان کیا ہے:

"جب سہرا ملاحظہ فرمایا تو مقطع کو دیکھ کر حضور کو بھی خیال، بلکہ ملال ہوا۔ استاد مرحوم جو حسب معمول حضور میں گئے، تو وہ سہرا دیا کہ استاد، اسے تو دیکھو! انھوں نے پڑھا اور بموجب عادت کے عرض کی: پیر و مرشد! درست۔ بادشاہ نے کہا: تم

۱- زینت محل نے غالب سے نہ صرف سہرے کی فرمائش کی، بلکہ شہزادے کی شادی کا رقعہ بھی غالب ہی نے لکھا۔ اس کا ثبوت غالب کا وہ خط ہے جس میں انھوں نے شادی کا رقعہ لکھنے کے سلسلے میں کچھ سوال کیے ہیں۔ اس خط میں مذکور ہے کہ رقعہ صمصام الدولہ کی طرف سے لکھا گیا ہے (صمصام الدولہ نواب زینت محل کے والد تھے)۔ اگرچہ خط میں شہزادے کا نام نہیں دیا گیا لیکن قرینِ قیاس یہی ہے کہ یہ رقعہ جواں بخت کی شادی کا تھا۔
(غالب کی نادر تحریریں، ص ۳۱)

۲- دیوان ذوق، ص ۲۵۷

www.paknovels.com

بھی ایک سہرا کہہ دو۔ عرض کی: بہت خوب۔ پھر فرمایا کہ ابھی لکھ دو؛ اور کہا: مقطع کو بھی دیکھا؟ عرض کی، حضور دیکھا۔"[1]

ذوق نے غالب کے مقطع کا جواب دیا:

جن کو دعویٰ ہو سخن کا، یہ سنا دو ان کو
دیکھو، اس طرح سے کہتے ہیں سخنور سہرا

غالب جیسے اداشناس آدمی کے لیے بادشاہ کے تیور سمجھنا مشکل نہیں تھا۔ انھوں نے فوراً ایک قطعۂ معذرت لکھ کر بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا۔ لیکن اپنی عادت سے مجبور تھے، اس میں یہ شعر بھی لکھ دیا:

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری
کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے[2]

اس شعر کا پس منظر یہ ہے کہ ذوق کے حسب و نسب کے بارے میں ان کے ہمعصر تذکرے خاموش ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ کوئی ان کے والد کا ذکر بھی نہیں کرتا۔ اس کے برعکس بعد کے تذکرہ نگاروں میں لالہ سری رام نے لکھا ہے کہ اُن (ذوق) کے خاندان کے لوگ اب بھی دہلی میں جراحی کا پیشہ کرتے ہیں۔ بہر حال یہ حقیقت ہے کہ ذوق کسی بڑے خاندان سے نہیں تھے۔ اس لحاظ سے اس شعر میں ذوق کے حسب و نسب پر گہرا طنز ہے۔ ظاہر ہے کہ ظفر کو یہ بات اور بھی ناگوار گذری ہوگی۔ غالب نے سہرے والے تمام معارضے کی تفصیل نواب انوار الدولہ بہادر شفق کو بڑے درد انگیز الفاظ میں لکھی ہے:

"از دیر باز سرِ دستان سرائیِ اردو ندارم۔ ہمانا از رضاجوئیِ شہریارِ سلیمان پیشگار است گاہ گاہ ناگاہ رنگِ ریختہ ریختن، ویژہ بفرمانِ بانوی بلقیس

۱۔ دیوان ذوق، ص ۲۵۸

۲۔ دہلی اردو اخبار کی ۲۸ مارچ ۱۸۵۲ء کی اشاعت میں مصرعِ ثانی اس طرح ہے:

علم و کمال و فضل سے نسبت نہیں مجھے

www.paknovels.com

پرستار است، در ریختہ بدین ردیف نارد ا دل آویختن مگر در مقطعِ غزل سرِ بستانہ ہوی زدہ باشم۔ آن یکے کہ گمانِ کمالی کہ نداشت، داشت، پنداشت کہ روے سخن سوے اُوست۔ در مقطعِ غزلی کہ سرود، بہنجارِ ستیزہ گام زد و دانست کہ گفتارِ مرا پاسخ ساز داد۔ من بہ سیہ مستی ایں تہ جرعہ کہ فرد ریختہ خامۂ من است ع

ہر چہ در گفتار فخرِ تست، آن ننگِ من است

سرِ سخن فرد دنیا ور دم و قطع نظر را دلیلِ قطعی امتیاز شمردم[1]۔"

اس خط سے دو باتیں واضح ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ غالب نے سہرا بانوی بلقیس پرستار (نواب زینت محل) کی فرمایش پر لکھا تھا، اور دوسرے یہ کہ معذرتی قطعے میں غالب نے کچھ بھی کہا ہو، ذوق کے فن کے بارے میں ان کی رائے قطعی بہت بُری تھی۔

یہ سہرے دہلی اُردو اخبار کی اشاعت ۲۸ مارچ ۱۸۵۲ء میں چھپے تھے۔ جواں بخت کی شادی ۲ اپریل ۱۸۵۲ء کو ہوئی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ شادی سے پہلے ہی یہ ہنگامہ ہو چکا تھا۔ اگر حالات معمول پر ہوتے، تو ممکن تھا کہ غالب اسی سہرے پر اکتفا کرتے، لیکن بادشاہ کی ناراضی دور کرنے کے لیے انھیں بیس اشعار کا ایک فارسی قطعہ جشنِ شادی اور سواریِ شہ کی مبارکباد میں لکھنا پڑا جس کا مطلع اور آخری شعر یہ ہیں:

بہار در چمن اندازِ گلفشانی کرد
بشاخِ نخلِ تمنا ثمر مبارکباد
ترا بقا و بقا را سعادت ارزانی
مرا دعا و دعا را اثر مبارکباد

معلوم ہوتا ہے کہ قطعۂ اعتذار اور اس فارسی قطعے کا بہادر شاہ ظفر پر کوئی خاص اثر نہیں ہوا۔ اور وہ غالب سے بدستور کبیدہ خاطر رہے۔ اس کا ثبوت وہ قصیدہ ہے جو غالب نے اس واقعے کے لگ بھگ چھ مہینے بعد یعنی اکتوبر میں ظفر کی سالگرہ پر لکھا تھا۔

۱۔ کلیاتِ نثرِ غالب، ص ۲۲۵

www.paknovels.com

اس چالیس اشعار کے فارسی قصیدے میں یہ اشعار بھی ہیں[1]:

ردیفِ شعر از آں کردم اختیار گرہ
کہ از من است برابر دی شہریار گرہ
ایا شہنشہِ کشور کشای دشمن بند
زبندہ، درِ خم ابرو روا مدار گرہ
کنم ببزم تو سازِ غزل بلند آواز
نگندہ است بدل طرحِ خار خار گرہ
بدلکشایی گفتارِ من کہ غالب را
مزن برشتۂ امید زینہار گرہ
از ایں گرہ کہ برابرو زدی، چرا ترسم
کہ در دلت زصفا، نیست پایدار گرہ

گویا سہرے والے معرکے کی تلخی کافی دن تک رہی۔ تقریباً دو سال بعد یعنی ۱۵ر نومبر ۱۸۵۴ء کی رات کو جب آخری چہار شنبہ کی تقریب منعقد ہو رہی تھی، شیخ ابراہیم ذوق کی وفات کی خبر دربار میں پہنچی۔ ظفر کو اپنے استاد سے دلی محبت تھی۔ اس خبر کا جو اثر ان کے دل و دماغ پر ہوا، اس کا حال سلطان الاخبار کی زبانی سنیے:

"گویند کہ ہرگاہ کہ ایں خبرِ تعزیت اثر سامعہ خراش بلکہ جاں تراشِ حضرت خدیو دہلی گردیدہ، باآنکہ در بارِ عام بتقریب آخری چہار شنبہ مہیا و مہذب و محفلِ جلوسِ سلطانی منعقد و مرتب بود و جمیع ارکانِ دولت و اعیانِ حضرت از بہرِ اقتباسِ انوار و ملازمت والا حاضر بودند، در حال برخاست و فرمود کہ بساطِ نشاط پیچیدہ شود و محفلِ انبساط موقوف گردد و شاہزادگانِ فرخندہ فال بلند اقبال باسائر

۱۔ یہ قصیدہ دہلی اُردو اخبار کی ۱۰ اکتوبر ۱۸۵۲ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا۔ یہ کلیاتِ غالب (نولکشور ۱۸۶۳ء، ص ص ۲۲۰-۲۲۲) میں موجود ہے۔

www.paknovels.com

ملازمین درگاہ و حاضرین بارگاہ شریک مشایعتِ جنازۂ آن مغفور شوند۔
محقق است کہ شاہِ دہلی دراین ماتم چنداں اشکِ حسرت ریخت و نعرہ زد کہ
گاہے چنیں گریہ و نالہ اش بوفاتِ شاہزادگانِ مرزا دارابخت و مرزا شاہ رخ
و مرزا فرخندہ شاہ وغیرہ ندیدہ اند و نشنیدہ "۱

اس پوری خبر سے اندازہ ہوتا ہے کہ بہادر شاہ ظفر کو ذوق سے کیسی محبت اور
عقیدت تھی۔ اسی لیے غالب جب ذوق کے فن اور ان کی شخصیت پر حملے کرتے تھے، تو ظفر
کو کتنا ناگوار گزرتا ہوگا۔ بظاہر اس کا امکان کم ہے کہ غالب کو ذوق کی وفات کا افسوس
ہوا ہو۔ لیکن اس کے باوجود ذوق اور ظفر کے تعلقات کے پیشِ نظر انھوں نے ذوق
کا قطعۂ وفات کہا۔ جس میں شاید پہلی اور آخری بار غالب نے اپنے قلم سے ذوق کو خاقانیِ
ہند لکھا ہے۔ ذوق کی وفات کے چوتھے دن یعنی ۱۹ نومبر ۱۸۵۴ء کی اشاعت میں دہلی
اُردو اخبار میں یہ قطعہ شائع ہوا تھا:

تاریخِ وفاتِ ذوق، غالب!
باخاطرِ دردمند، مایوس
خوں شد دلِ زار، تا نوشتم
خاقانیِ ہند، مُرد افسوس

غالب نے ذوق کی وفات پر ایک اور قطعہ بھی کہا تھا:

گویند رفت ذوق ز دنیا ستم بود
کان گوہر گران بہ تہِ خشت و گل نہند
تاریخِ فوتِ شیخ بود " ذوق جنّتی "
بر قولِ من رواست کہ احباب دل نہند۲

۱۔ سلطان الاخبار بحوالہ نوائے ادب (بمبئی) جولائی ۱۹۵۸ء: ص ص ۴۴ ۔ ۴۵

۲۔ باغ دو در، ص ۲۷

www.paknovels.com

کچھ ہی عرصے بعد ایک اچھے انسان کی طرح غالب نے ذوق کی طرف سے اپنا دل صاف کر لیا۔ وہ ذوق کی وفات کے چند ہی روز بعد یعنی ۲۳ نومبر ۱۸۵۴ء کو اپنے دوست منشی نبی بخش حقیر کو لکھتے ہیں :

"یہاں کا حال تازہ یہ ہے کہ میاں ذوق مر گئے۔ حضورِ والا نے ذوقِ شعر و سخن ترک کیا۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ شخص اپنی وضع کا ایک اور اس عصر میں غنیمت تھا۔"[1]

یہ بات قابلِ غور ہے کہ غالب کی زبان سے ذوق کے بارے میں یہ کلمۂ خیر پہلی بار نکلا تھا۔

قلعہ میں ملازمت

ظفر اور غالب کے تعلقات خوشگوار نہیں تھے اور زیادتی بھی غالب ہی کی طرف سے ہوئی تھی۔ اس کے باوجود ایک موقع پر ظفر نے غالب کا ساتھ دے کر اپنی وسیع القلبی کا ثبوت دیا۔ ہوا یوں کہ ۲۵ مئی ۱۸۴۷ء کو غالب جوئے کے الزام میں دوبارہ گرفتار ہو گئے[2]۔ ظفر چاہتے تو اس معاملے میں خاموش رہتے۔ لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا، بلکہ انگریز ریذیڈنٹ کو خط لکھ کر غالب کی سفارش کی۔ احسن الاخبار ۲۵ / جون ۱۸۴۷ء کی اشاعت میں درباری مصروفیات کے تحت یہ خبر دی گئی ہے :

"مرزا اسد اللہ خاں بہادر کو دشمنوں کی غلط اطلاعات کے باعث قمار بازی کے جرم میں گرفتار کر لیا گیا۔ معظم الدولہ بہادر کے نام سفارشی چٹھی بھی لکھی گئی کہ ان کو رہا کر دیا جائے کہ یہ معززینِ شہر میں سے ہیں۔ یہ جو کچھ ہوا ہے، محض حاسدوں کی فتنہ پردازی کا نتیجہ ہے۔ عدالتِ فوجداری سے نواب صاحب کلاں بہادر

۱۔ خطوط غالب (مالک رام)، ص ۱۵۰

۲۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، ذکرِ غالب، ص ص ۱۰۵-۱۱۰

www.paknovels.com

نے جواب دیا کہ مقدمہ عدالت کے سپرد ہے، ایسی حالت میں قانون سفارش قبول کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔"[1]

اگرچہ ظفر کی سفارش بیکار گئی، لیکن یہ ان کی عظمت کا ثبوت ضرور ہے۔ اس واقعے کے کچھ ہی عرصے بعد یعنی ۴ جولائی ۱۸۵۰ء (مطابق ۲۳ شعبان ۱۲۶۶ھ) کو ظفر نے غالب کو خاندانِ تیموریہ کی تاریخ لکھنے پر مقرر کر دیا۔ اس واقعے کی تفصیل خود غالب کی زبانی سنیے، جو انھوں نے مہر نیمروز کے دیباچے میں لکھی ہے[2]۔

بہ پنجشنبہ نامور و بست و سوم شعبان سالِ یکہزار و دو صد و شصت و شش ہجری با چہارم جون[3] سالِ یکہزار و ہشتصد و پنجاہ عیسوی.... شہنشاہ بشکوہی کہ پنداری، آفتاب است، در بیت اشرف بر اورنگ نشستہ دین بہ نشاطیکہ گوئی عطار داست، در تعلیم رد برد ایستادہ، و کارپردازانِ شاہی بفرمانِ حضرتِ ظلِّ الٰہی بہ خلعت خانۂ خاصم بردند، و قامتم را بہ خلعتِ شش پارچہ آراستہ، ببلاگاہم آوردند۔ خداوندِ دنیا و دیں بداں دستِ بخشش آئین کہ کف آن دست دریائیست کہ ہفت دریا در کفِ اوست جگر گوشہ ہای معدن یعنی جیغہ و سرپیچ بسرم بست و رگ جان ابرنیساں یعنی حمایل مروارید بگردنم آویخت .... غالب سخن سرای را نجم الدولہ و دبیر الملک و نظام جنگ خواند۔

غالب نے جن الفاظ میں خلعت اور خطابات ملنے کا ذکر کیا ہے۔ اس سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ غالب کے لیے یہ تقرر باعثِ فخر[4] تھا جس دن غالب خلعت اور

۱۔ احسن الاخبار، بمبئی (۲۵ جون ۱۸۴۷ء) بحوالہ دہلی کا آخری سانس، ص ۱۷۱

۲۔ مہر نیمروز (بشمول کلیات نثر غالب)

۳۔ غالب سے سہو ہوا ہے۔ یہ مہینہ جولائی کا تھا، جون کا نہیں۔ خ۔ا۔

۴۔ اگرچہ غالب کے لیے یہ ملازمت بہت اعزاز کی بات تھی۔ لیکن حادثۂ اسیری سے

(باقی ص ۳۳ پر)

www.paknovels.com

خطابات سے سرفراز ہوئے ہیں۔ اسی دن انھوں نے نواب محمد مصطفیٰ خاں شیفتہ کو ایک خط میں اس کی تفصیل لکھی ہے۔ جس سے ایک اور حقیقت کا پتہ چلتا ہے۔ وہ یہ کہ غالب کو بادشاہ کے دربار میں ۵ رجولائی بروز جمعہ حاضر ہونا تھا لیکن حکیم احسن اللہ خاں نے ایک دن پہلے ہی بلوالیا۔ مزید یہ کہ تقرر کے وقت غالب بددلی کا شکار تھے۔ اور حادثۂ اسیری سے ان کی جو رسوائی اور ذلت ہوئی تھی، اس کا اثر ابھی تک ان کے ذہن پر تھا۔ خط ملاحظہ ہو:

روزِ چہارشنبہ یعنی دیروز عرضہ داشتہ ام کہ روزِ آدینہ بارم می دہند و بعطاے خلعت و خطاب و توقیع نوکری برمن سپاس می نہند۔ احترام الدولہ بہادر (حکیم احسن اللہ خاں) بمقتضاے فحواے ایں فرد۔

فرداست وعدۂ جنّت و امروز شد نصیب
آرے خلافِ وعدہ کریماں چنیں کنند

ہم امروز کہ روزِ سعدِ اکبر است مرا بہ بزمِ خسروی خواند و کامیابِ خطاب و خلعت و فرمانم گرداند۔ دی شحنۂ شہر "بدمعاش" دمیرِ بساطم نوشت و از من ہیچ نکاست،

۱۔ غالب نے (غالباً فروری ۱۸۴۸ء میں) منشی نبی بخش حقیر کو فارسی خط میں لکھا تھا کہ کل ایک تیموری شہزادے نے مشاعرہ منعقد کیا تھا۔ میں نے کوشش کی کہ غزل کہوں، مگر نہ کہی گئی۔ جب قلعہ جانے کے لیے سوار ہوا، تو بے اختیار چند شعر ہو گئے۔ پھر غالب نے وہ غزل نقل کی ہے۔ جس کے کئی اشعار اس ذہنی کرب کے آئینہ دار ہیں جو حادثۂ اسیری سے وجود میں آیا تھا۔ وہ اشعار ملاحظہ ہوں:

دے وہ جس وقت ذلت ہم ہنسی میں ٹالیں گے
بارے آشنا نکلا، ان کا پاسباں اپنا

درد دل لکھوں کب تک، جاؤں ان کو دکھلادوں
انگلیاں فگار اپنی، خامہ خوں چکاں اپنا

ہم کہاں کے دانا تھے، کس ہنر میں یکتا تھے
بے سبب ہوا، غالب دشمن آسماں اپنا

(تلاشِ غالب، ص ۱۴۲)

www.paknovels.com

امروز بادشاہِ دہلی نجم الدولہ دبیر الملک خواند و برمن ہیچ نیفزود۔ کار با فرداست، تا دراں روزم چہ نویسند و بکدام نامم خوانند و دراں چہ ارزم بود ...... تاریخِ نوکریِ من در سرکارِ شاہ بعہدۂ تاریخ نویسیِ اسلافِ این خاندان بمشاہرۂ پنجاہ روپیہ، یکم ہمین ماہ است۔ یعنی وصولِ زرِ تن خواہ در سالے دوبار است!

شاہی ملازمت ملنے پر غالب نے یہ غزل بادشاہ کی خدمت میں پیش کی۔

دائم پڑا ہوا، ترے در پر، نہیں ہوں میں
خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں میں
کیوں گردشِ مدام سے گھبرا نہ جائے دل؟
انسان ہوں، پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں
یارب! زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لیے؟
لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرّر نہیں ہوں میں
حد چاہیے سزا میں، عقوبت کے واسطے
آخر گناہگار ہوں، کافر نہیں ہوں میں
کس واسطے، عزیز نہیں جانتے مجھے؟
لعل و زمرّد و زر و گوہر، نہیں ہوں میں
رکھتے ہو تم قدم مری آنکھوں سے کیوں دریغ؟
رتبے میں مہر و ماہ سے کمتر، نہیں ہوں میں
کرتے ہو مجھ کو منعِ قدمبوس کس لیے؟
کیا آسمان کے بھی برابر، نہیں ہوں میں
غالب! وظیفہ خوار ہو، دو شاہ کو دعا
وہ دن گئے جو کہتے تھے: "نوکر نہیں ہوں میں"

۱- تلاشِ غالب، ص ۸۹

www.paknovels.com

اکثر شارحینِ غالب نے پانچویں، چھٹے اور ساتویں شعر کو نعتیہ قرار دیا ہے؛ اور محققینِ غالب نے کبھی اس طرف توجہ نہیں کی، حال آنکہ اس کا قوی امکان ہے کہ ان تمام اشعار میں غالب کے مخاطب صرف بہادر شاہ ظفر ہوں۔ اس سلسلے میں سب سے اہم دلیل یہ ہے کہ غالب نے شاہی ملازم ہونے پر یہ غزل ظفر کی خدمت میں پیش کی تھی جس کا ذکر انھوں نے خود نواب کلب علی خاں کے نام ایک خط میں کیا ہے۔[1] اس غزل میں انھوں نے اپنی پریشان حالی کا ذکر کیا ہے، اپنی غلطیوں کا اعتراف کیا ہے؛ اور بادشاہ کی اُس بے اعتنائی کا شکوہ کیا ہے جو وہ اب تک غالب سے برتتے رہے تھے۔ آخری پانچ شعر غالب اور ظفر کے تعلقات کو سمجھنے کے لیے بہت اہم ہیں۔

تیموریہ خاندان کی اس تاریخ کا نام غالب نے پرتوستان رکھا تھا۔ وہ اسے دو حصّوں میں لکھنا چاہتے تھے: پہلا، مہرِ نیم روز۔ آغازِ روزگار سے ہمایوں بادشاہ تک۔ دوسرا، ماہِ نیم ماہ: اکبر سے ظفر تک۔ پہلا حصّہ ۱۲۷۱ھ میں فخر المطابع سے شائع ہوا تھا؛ دوسرے کے لکھنے کی نوبت ہی نہیں آئی۔

۱- ایک مدت بعد غالب نے نواب کلب علی خاں والیِ رام پور کو ایک خط میں لکھا: "بعد تسلیم معروض ہے جب بادشاہِ دہلی نے مجھ کو نوکر رکھا اور خطاب دیا اور خدمت تاریخ نگاریِ سلطانِ تیموریہ مجھ کو تفویض کی تو میں نے ایک غزل طرزِ تازہ پر لکھی۔ مقطع اس کا یہ ہے "غالب وظیفہ خوار ہو دو شاہ کو دعا" اب مقطع کی صورت بدل کر حضور کی نذر کرتا ہوں۔ خدا کرے کہ حضرت کو پسند آئے۔"
غالب نے اس غزل کے مقطع کو بدل کر اس طرح قطعہ کر دیا:

در پر امیر کلب علی خاں کے ہوں مقیم
شائستۂ گدائیِ ہر در نہیں ہوں میں
بوڑھا ہوا ہوں، قابلِ خدمت نہیں اسد
خیرات خوارِ محض ہوں، نوکر نہیں ہوں میں

(مکاتیب غالب، ص ۵۳)

www.paknovels.com

پہلی ششماہی ختم ہونے پر غالب نے فیصلہ کر لیا کہ وہ ماہ بماہ تنخواہ کی درخواست کریں گے۔ اور اگر یہ درخواست منظور نہ ہوئی تو اس خدمت سے سبکدوش ہو جائیں گے۔

۲ر جنوری ۱۸۵۱ء کے ایک خط میں منشی نبی بخش حقیر کو لکھتے ہیں:

"اب چھ مہینے پورے ہو چکے، جولائی سے دسمبر ۱۸۵۰ء تک۔ اب میں دیکھوں یہ ششماہہ مجھے کب ملتا ہے! بعد اس کے ملنے کے، اگر آئندہ ماہ بماہ کر دیں گے تو میں لکھوں گا، ورنہ اس خدمت کو میرا سلام ہے۔"[1]

غالب نے اس سلسلے میں بہادر شاہ ظفر کی خدمت میں ایک منظوم درخواست پیش کی تھی۔ یہ درخواست اُن کا وہی مشہور قطعہ ہے جس کا پہلا مصرع ہے:

اے شہنشاہِ آسماں اورنگ!

غالباً اُن کی یہ درخواست قبول ہو گئی، اور انھیں ماہ بماہ تنخواہ ملنے لگی تھی کیونکہ وہ اس کے بعد بھی کام حسبِ سابق کرتے رہے۔

یہاں اُن چند فارسی اشعار کا ذکر بھی ضروری ہے جو غالب نے مہر نیم روز کے دیباچے میں شاعرانہ تعلی کے طور پر لکھے ہیں۔ سہرے پر اتنے بڑے ادبی معرکے کی ایک وجہ سہرے کا وہ مقطع بھی تھا جس میں غالب نے شاعرانہ تعلی سے کام لیا تھا۔ احتیاط کا تقاضا یہ تھا کہ وہ آئندہ اس طرح کی تعلی سے گریز کرتے۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ غالب خود کو اپنے عہد کا سب سے بڑا فنکار سمجھتے تھے جو حقیقت بھی تھی۔ اسی لیے جب بھی موقع ملتا وہ اپنا یہ حق منوانے پر اصرار کرتے۔ اس معاملے میں ان کی خاص توجہ بہادر شاہ ظفر پر تھی۔ کیونکہ وہ کچھ بھی سہی، تھے تو بادشاہ.....

مہر نیم روز کے دیباچے میں غالب کے یہ فارسی اشعار ملاحظہ ہوں۔

بچشمِ کم منگر گرچہ خاکِ راہِ توام
کہ آبروی دیارم دریں خلافت گاہ

۱- خطوطِ غالب (مرتبہ مالک رام) ص ۱۰۵

www.paknovels.com

کمال بین کہ بدین غصہ ہای جاں فرسا
ہنر نگر کہ بدین فتنہ ہای طاقت گاہ
مربی سخنم من بمایہ داری فکر
ز نطق من بودش عیش ہای خاطر خواہ
باخذ فیض ز مبدا فزودنم از اسلاف
کہ بودہ ام قدری دیرتر دراں درگاہ
نزول من بجہاں بعد یکہزار و دویست
ظہورِ سعدی و خسرو بہ ششصد و پنجاہ
سخن ز نکتہ سرایانِ اکبری چہ کنی
چو من بخوبی عہد توام زخویش گواہ
کنوں تو شاہی و من مدح گو تعال تعال
گذشت دورِ نظیری و عہدِ اکبر شاہ
بفنِ شعر چہ نسبت بمن نظیری را
نظیر خود بہ سخن ہم فہم سخن کوتاہ

ظفر کی شیعیت اور غالب

اپنے آبا و اجداد کی طرح ظفر بھی عقیدے کے اعتبار سے سنّی تھے لیکن آخری عمر میں شیعیت کی طرف ان کا رجحان ہوگیا تھا۔ جب بادشاہ کے اس اقدام کی ہر سطح پر مخالفت ہوئی تو انھیں مجبوراً اس خبر کی تردید کرنا پڑی۔ اس سلسلے میں بادشاہ کے نام سے ایک فارسی مثنوی شائع ہوئی جس میں کہا گیا کہ وہ بدستور سنّی ہیں اور ان کے شیعی مذہب اختیار کرنے کی خبر قطعاً غلط اور بے بنیاد ہے۔ ایسی شہادت موجود ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ مثنوی غالب کی تصنیف ہے۔ اب اس اجمال کی تفصیل ملاحظہ ہو۔ مذہبی اعتبار سے ظفر راسخ العقیدہ نہیں تھے۔ بعض حلقوں میں یہ مشہور تھا کہ وہ

www.paknovels.com

بدعتی ہیں۔ سرسید لکھتے ہیں:

"دلّی میں ایک بڑا گروہ مولویوں کا اور اُن کے تابعین کا ایسا تھا کہ وہ مذہب کی رُو سے معزول بادشاہِ دلّی کو بہت بُرا اور بدعتی سمجھتا تھا۔ اُن کا یہ عقیدہ تھا کہ دلّی کی جن مسجدوں میں بادشاہ کا قبضہ و دخل اور اہتمام ہے، ان مسجدوں میں نماز درست نہیں۔ چنانچہ وہ جامع مسجد میں بھی نماز نہیں پڑھتے تھے اور غدر سے بہت قبل کے چھپے ہوئے فتوے اس معاملے میں موجود ہیں۔"[۱]

۱۸۵۳ء میں ظفر ایسے بیمار ہوئے کہ ان کی جان کے لالے پڑ گئے۔ بقول اسپیر:

"سنہ ۱۸۵۳ء میں ان (بادشاہ) پر انتڑیوں کی بیماری کا حملہ ہوا اور وہ ابھی اس سے پوری طرح شفایاب نہیں ہونے پائے تھے کہ کثرتِ عیاشی نے انھیں موت کے دہانے پر لا کھڑا کر دیا۔"[۲] (انگریزی سے ترجمہ)

غالب نے بادشاہ کی اس بیماری کا حال منشی نبی بخش حقیر کو ان الفاظ میں لکھا ہے:

"بادشاہ کا حال کیا پوچھتے ہو۔ اور اگر تم نے پوچھا ہے تو میں کیا لکھوں۔ دست موقوف ہو گئے مگر کبھی کبھی آجاتے ہیں۔ تپ جاتی رہی مگر گاہ گاہ حرارت ہو آتی ہے۔ ہچکی اس شدّت کی نہیں رہی۔ گاہ گاہ چھاتی جلتی رہتی ہے اور ڈکار سی آتی ہے۔ ہوادار پلنگ کے برابر لگا دیتے ہیں اور حضرت کو پلنگ پر سے ہوادار پر بٹھا دیتے ہیں۔ اس ہیئت سے برآمد بھی ہوتے ہیں۔ قلعہ ہی قلعہ میں پھر کر پھر محل میں داخل ہو جاتے ہیں۔ یوں تصوّر کیجیے اور مشہور بھی یوں ہی ہے کہ مرض جاتا رہا اور ضعف باقی ہے۔ بہر حال جب تک سلامت رہیں، غنیمت ہے۔"[۳]

۱- اسبابِ بغاوتِ ہند، ص ۱۰۸

۲- P. SPEARES : TWILIGHT OF THE MUGHALS, P.P. 7--15

۳- نادراتِ غالب، ص ص ۴۲ - ۴۳

www.paknovels.com

بیماری کے دوران ظفر کو بقول اُن کے بشارت ہوئی کہ وہ حضرت عبّاس کی درگاہ میں عَلَم چڑھائیں۔ مرزا حیدر شکوہ نے ایک خط میں اس واقعہ کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

"میں کلکتہ میں تھا اور مجھے شاہی شقہ پہنچا، جس میں خواب کا بیان اور حضرت کی درگاہ میں عَلَم چڑھانے کا مذکور تھا۔ اس کے بعد جب میں حاضر ہوا، تو پھر خواب دیکھنے کا حال بیان فرمایا اور اہلِ بیت کی محبّت کا اظہار اور تعمیرِ امام باڑہ کا قصد برائے تعزیہ داریِ سیّد الشہدا شغل اپنے جدِ اعلیٰ امیر تیمور صاحبقران بیان کیا۔"[1]

بادشاہ نے صحتیاب[2] ہو کر واقعی حضرت عبّاس کی یادگار پر عَلَم چڑھانے کی تیاری شروع کر دی۔

دہلی اُردو اخبار اس واقعے کی خبر ان الفاظ میں دیتا ہے:

"چہار شنبہ کو حضور والا نے نقشہ ایک عَلَم کا بہت تحفہ اپنے ہاتھ سے مع طغرای اسم مبارک جناب حضرتِ عبّاس علیہ السّلام کے کھینچ کر کاریگروں کو دیا اور حکم ہے کہ جلد تیار ہو۔ اور صاحب عالم مرزا نور الدین بہادر سے حضور والا نے فرمایا کہ تم جا کے لکھنؤ میں بآدابِ شایستہ درگاہ میں جناب عباس علیہ السّلام کے چڑھا کے جلد پھر حضور میں حاضر ہو، سُنا جاتا ہے کہ اس کی بشارت ہوئی تھی، حضور والا کو۔۔۔۔"[3]

۱۔ دستور العملِ اودھ بحوالۂ معارف اپریل ۱۹۲۲ء : ۲۸۶

۲۔ اسی موقع پر غالب نے بادشاہ کی خدمت میں وہ قطعہ پیش کیا تھا، جس کا مقطع ہے:

کیوں نہ دنیا کو ہو خوشی غالب
شاہِ دیندار نے شفا پائی

۳۔ دہلی اُردو اخبار (۴ ستمبر ۱۸۵۳ء) بحوالہ نوائے ادب (بمبئی)، اپریل ۱۹۵۸ء : ص ص ۳۵-۳۶

www.paknovels.com

دہلی اُردو اخبار کے اسی شمارے میں بادشاہ کے بارے میں یہ خبر بھی ہے[1] کہ "عنقریب غسلِ صحت اور جشنِ صحت ہووے۔" کچھ دن بعد دہلی اُردو اخبار نے بادشاہ کے ایک مجلس میں شریک ہونے کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

"بدھ کے دن مرزا عالی بخت کے مکان میں (بادشاہ) شریکِ مجلس ہوئے اور دیر تک مرثیے سُنے۔ اور آپ بھی فضیلتِ ائمہ بیان کرتے رہے اور جمعرات کو عَلَم جو حضورِ والا نے تیار کروایا ہے، اور وہ بہت خوبصورت بن کر آیا ہے، حضورِ والا نے کمالِ آداب و قرینے سے اپنے سرِ مبارک پر رکھا اور صاحبِ عالم مرزا نور الدین[2] بہادر کو وہ عَلَم سپرد کر کے بہ سبیل ڈاک لکھنؤ کو رخصت کیا۔ ہر چند علم مبارک کے بنانے پر اکثر آلِ تیمور مغفور مانع بھی رہے، مگر حضور نے کسی کی بھی نہیں سُنی اور جو ذہنِ مبارک میں آیا، وہی کیا، بعض لوگ اس بات سے بھی بہت رنجیدہ ہوئے کہ حضورِ والا سے اُن کے برخلاف یہ امرِ جلیل ہوا ہے بلکہ حضورِ والا نے اکثر اپنی زبانِ مبارک سے حاضرینِ دربارِ معلیٰ سے فرمایا کہ اکثر آلِ تیموری اور اشخاص نے مجھ سے عرض کی اس عَلَم مبارک بنانے میں اور لکھنؤ بھیجنے میں آپ رافضی مشہور ہوں گے۔ میں نے جواب دیا کہ مجھ کو الفتِ پنجتنِ پاک میں سب باتیں منظور ہیں۔ اگر ان کی محبت سے آدمی رافضی ہوتا ہے تو جو جس کا جی چاہے کہے۔ کہنے والے اپنا سا منھ لے کر رہ گئے۔"[3]

اسی دوران میں بہادر شاہ ظفر نے لکھنؤ کے مجتہد العصر سلطان العلما سید محمد صاحب

۱- دہلی اردو اخبار (۴ ستمبر ۱۸۵۳ء) بحوالہ نوائے ادب (بمبئی) اپریل ۱۹۵۸ء، ص ۳۵

۲- مرزا نور الدین بہادر اور مرزا حیدر شکوہ یہ دونوں سلیمان شکوہ کے پوتے تھے اور شیعی تھے۔

۳- دہلی اُردو اخبار (۹ اکتوبر ۱۸۵۳ء) بحوالہ نوائے ادب (بمبئی) اپریل ۱۹۵۸ء، ص ۳۶

www.paknovels.com

کو ایک خط میں لکھا:

"اللہ کا شکر ہے کہ محبتِ اہلِ بیت علیہم السّلام دل سے میں نے اختیار کی ہے اور حضرت علی علیہ السّلام کے دشمنوں سے قطعی تبرّا کیا ہے۔ امام باڑہ کی تعمیر شروع ہو گئی ہے۔ عمارت تمام ہو جانے کے بعد جناب سیّد الشہدا کی مجالسِ تعزیت ہوا کریں گی۔ میری کوشش ہے، اتمام اللہ تعالیٰ کے ہاتھ ہے۔ مفصّل مدارج دین کے جن پر میں راسخ ہوں، مرزا محمد حیدر شکوہ کی زبانی معلوم ہوں گے؛ وہ اس معاملے میں راز دار ہیں۔"[1]

اس کا مطلب یہ ہے کہ بہادر شاہ ظفر نے نہ صرف عَلَم لکھنؤ بھیجا، بلکہ دلّی میں ایک امام باڑے کی تعمیر بھی شروع کر دی تھی۔ یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ یہ امام باڑہ کہاں بننا شروع ہوا تھا اور کس منزل پر اس کی تعمیر رک گئی تھی۔

جب عَلَم چڑھانے میں تاخیر ہوئی، تو ظفر نے مرزا نور الدین بہادر کو لکھا:

"عَلَم جلد درگاہِ حضرت عباس میں چڑھا کر حاضر ہو۔ معلوم نہیں کہ تم نے عَلَم چڑھایا یا نہیں۔ طمعِ دنیا کے لیے یہ عَلَم پیش نہیں کیا ہے۔ خدا ہی جانتا ہے کہ میں نے کیا دیکھ کر عَلَم بھیجا ہے۔"[2]

دہلی کے ایجنٹ امین الدولہ سائمن فریزر دلیر جنگ کے ایک خط بنام جانشین

۱۔ دستور العمل اودھ (قلمی) بحوالۂ معارف اپریل ۱۹۲۲ء ص ۲۸۰۔ رضا لائبریری رامپور میں دستور العمل اودھ کا ایک قلمی نسخہ محفوظ ہے۔ جس میں ظفر کی شیعیت کے سلسلے میں خود ظفر، مولانا سیّد محمد صاحب اور دوسرے لوگوں کے خطوں اور دوسری تحریروں کی نقلیں موجود ہیں۔ یہ تمام تحریریں حافظ احمد علی خاں نے اپریل اور مئی ۱۹۲۲ء کے معارف میں شائع کی تھیں۔ حافظ صاحب نے تمام فارسی تحریروں کا اُردو ترجمہ بھی ساتھ دیا ہے۔

۲۔ دستور العمل اودھ (قلمی) بحوالۂ معارف، اپریل ۱۹۲۲ء، ص ۲۸۱

www.paknovels.com

ایجنٹ اودھ سے پتہ چلتا ہے کہ :

"چھٹی ربیع الاوّل (۱۲۷۰ھ) سنہ حال کو مرزا حیدر شکوہ بہادر و مرزا نورالدین حیدر بہادر شیعی مذہب نے ایک عَلَم کمال تجمل سے عمائدین شہر کے جلوس کے ساتھ حضرتِ عباس کی درگاہ پر چڑھایا، اور سید محمد مجتہد العصر نے اپنے ہاتھ سے عَلَم نصب کیا اور مرزا نورالدین نے منبر پر بیٹھ کر ایک اُردو کا مرثیہ جس میں صحابہ کی بے ادبی تھی، مجمع کثیر میں بآواز بلند پڑھا اور مرثیہ کے مقطع میں حضور (بادشاہ) کا تخلّص درج تھا[1]۔"

دستور العملِ اودھ[2] سے پتہ چلتا ہے کہ بہادر شاہ ظفر کے اس اقدام کو انگریزوں نے اور خود تیموریہ شہزادوں نے بھی پسند نہیں کیا۔ چنانچہ دہلی اُردو اخبار لکھتا ہے:

"ہر چند عَلَمِ مبارک کے بنانے پر اکثر آلِ تیمور مغفور مانع بھی آئے، اور جب تیار ہو چکا تو بھیجنے پر لکھنؤ کے بھی مانع رہے، مگر حضور نے کسی کی بھی نہ سُنی اور جو ذہنِ مبارک میں آیا، وہی کیا۔ بعض لوگ اس بات سے بہت رنجیدہ ہوئے کہ حضورِ والا سے ان کے برخلاف یہ امر جلیل ہوا ہے[3]۔"

آلِ تیمور کی مخالفت تو برداشت کی جا سکتی تھی لیکن مصیبت یہ آئی کہ انگریزوں نے بھی بہادر شاہ کے شیعی مذہب اختیار کرنے کی مخالفت کی۔ وہ دراصل اسے ایک سیاسی اقدام سمجھتے تھے۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ بہادر شاہ ظفر جواں بخت کو ولی عہد

۱۔ دستور العمل اودھ (قلمی) بحوالہ معارف اپریل ۱۹۲۲ء، ص ۲۸۲

۲۔ مالک رام صاحب کا یہ خیال ہے کہ یہ کتاب جعلی ہے۔ ممکن ہے کہ ایسا ہو، لیکن اس حقیقت سے انکار مشکل ہے کہ بہادر شاہ ظفر کا شیعیت کی طرف رجحان ہو گیا تھا۔ سرکاری کاغذات اور دہلی اُردو اخبار سے بھی اس امر کی تصدیق ہوتی ہے۔ (خ۔ ا)

۳۔ دہلی اُردو اخبار، ۹ر اکتوبر ۱۸۵۳ء

www.paknovels.com

بنانا چاہتے تھے۔ ان کی تمام درخواستوں اور کوششوں کے باوجود انگریزوں نے جون ۱۸۵۲ء میں مرزا فخرو کو ولی عہد مقرر کر دیا۔ اس پر بہادر شاہ انگریزوں سے بددل ہو گئے۔ اس واقعے کے کچھ ہی دن بعد ظفر کے شیعی مذہب اختیار کرنے کا واقعہ پیش آیا اس پر انگریزوں کو غالباً یہ خیال گزرا کہ ظفر اس طرح سیاسی اعتبار سے اودھ اور ایران کے قریب آنا اور ان سے مدد لینا چاہتے ہیں[1]

اس سلسلے میں سب سے اہم بیان حکیم احسن اللہ خاں کا ہے جو انھوں نے عدالت میں بہادر شاہ ظفر پر مقدمے کے دوران بطور گواہ دیا تھا۔ حکیم صاحب نے اپنا بیان شروع ہی اس واقعے سے کیا تھا۔ انھوں نے کہا: "لارڈ ایلن برو کے عہد میں جس وقت سے گورنر جنرل کا بادشاہ کو نذر دینا بند ہوا ہے بادشاہ ہر وقت اداس رہا کرتے تھے۔ اولاً تو انھوں نے اس معاملے کے لیے ولایت میں تحریک کی اور بعد میں ہمیشہ اس حکم کے شاکی رہے۔ اس کے سبب اپنی بددلی ظاہر کرتے رہے۔ بعد میں جب گورنمنٹ نے ان کی یہ خواہش کہ ان کا چھوٹا بیٹا جواں بخت باوجودیکہ یہ طے پاچکا تھا کہ سب سے بڑا لڑکا مرزا فتح الملک اُن کے بعد گدی نشین ہوگا ولی عہد بنا

۱۔ جب ۱۸۵۷ء کے انقلاب کی ناکامی کے بعد بہادر شاہ ظفر پر مقدمہ چلا تو مکند لال نے عدالت میں بیان دیتے ہوئے کہا:

> بادشاہِ دہلی دو سال گزرے (یہ مدّت چار سال ہونی چاہیے، خ۔ا) جب برٹش گورنمنٹ سے بدظن ہو گئے تھے اور طے کر لیا تھا کہ وہ آیندہ انگریزوں کی بالکل خاطر اور عزّت نہیں کیا کریں گے مفصل حالات یہ ہیں کہ جب مرزا حیدر شکوہ اور مرزا مراد فرزندانِ مرزا جان بخش ابنِ مرزا سلیمان شکوہ لکھنؤ سے یہاں آئے تو شاہ حسن عسکری نے بادشاہِ دہلی کو بادشاہِ ایران کے پاس خط روانہ کرنے کی رائے دی تھی۔
>
> (بہادر شاہ کا مقدمہ، ص ۹۵)

www.paknovels.com

دیا جائے، پوری نہ کی تو ان کو اور بھی زیادہ رنج ہوا۔ اس کے کچھ عرصہ کے بعد مرزا حیدر پسر خان بخش پسر مرزا سلیماں شکوہ مع اپنے بھائی مرزا مراد کے لکھنؤ سے دہلی آئے۔ وہ بیشتر بادشاہ سے ملاقات کیا کرتے تھے ..... یہ شہزادے بادشاہ کی مہر ثبت کر کے چند کاغذات اپنے ہمراہ لے گئے ..... لکھنؤ جا کر مرزا حیدر نے ایک عَلَم تو بادشاہ کی طرف سے شاہ عباس کے مقبرے پر چڑھایا اور ایک پنسلی نوٹ جس پر بادشاہ کی مہر ثبت تھی اور جس کا مضمون یہ تھا کہ میں سنّی فرقے کو ہند میں شیعہ کرنا اور خود شیعہ ہونا چاہتا ہوں، مجتہد کو دیا۔ یہ خبر چند اور شاہزادوں کے خطوط سے جو سنّی تھے اور چند سنیوں کی درخواست سے معلوم ہوا ..... جب یہ خبر شہر میں مشہور ہوئی تو خاص خاص علما، بادشاہ کے پاس گئے اور اس کی اصلیت دریافت کرنی چاہی۔ بادشاہ نے جواب دیا کہ مرزا حیدر نے بہت سے لکھے ہوئے کاغذوں پر میری مہر ثبت کی تھی اور ان کو اپنے ہمراہ لکھنؤ لے گیا تھا۔ اور ایک شقہ میں نے مجتہد کو بھی لکھا تھا جس کا مضمون یہ تھا کہ مجھے اہلِ بیت سے محبت ہے اور جس کو ان سے اُنس نہ ہو، وہ مسلمان نہیں ہے۔ بعد میں بادشاہ کی درخواست پر ایجنٹ لفٹنٹ گورنر نے اس شقہ کی ایک نقل مجتہد سے منگا دی اس کا مضمون بالکل وہی تھا جو درخواستوں سے معلوم ہوا تھا۔ اس سے یہ یقین ہو گیا کہ علاوہ شقہ کے بادشاہ نے شاہِ اودھ کو بھی جو شیعہ تھا کوئی تحریر بھیجی تھی ..... ایک ہی سال بعد مرزا نجف کے ایران جانے کی خبر اُڑی۔ مرزا نجف مرزا حیدر کے بھائی ہیں اور بادشاہِ دہلی کے بھتیجے۔ یہ خبر مولوی باقر کے اخبار میں چھپی تھی۔ اس میں یہ بھی لکھا تھا کہ شاہ ایران نے ان کے ساتھ بہت اچھا برتاؤ کیا۔ میں نے مرزا نجف کے بڑے دوست مرزا علی بخت سے دریافت کیا تھا کہ وہ بادشاہ کی طرف سے کوئی خط شاہ ایران کے نام لے گئے ہیں۔ انھوں نے خط کا اقرار کیا اور کہا۔ اس میں بادشاہ نے یہ لکھوایا کہ میں شیعہ ہو گیا ہوں۔ میری مدد کرو۔ میری حالت اس وقت بہت زبوں ہے مگر اس کا کوئی جواب نہیں آیا ..... چونکہ مرزا حیدر نے بادشاہ کے مذہب کی تبدیلی کرائی تھی اس لیے یہ کل معاملات سنیوں سے (جن میں ایک میں بھی ہوں) چھپائے گئے تھے۔ مگر یہ خبریں

مجھے اور لوگوں سے معلوم ہوئیں.... (مرزا حیدر) نے بادشاہ کے مذہب بدلنے پر اپنا ذاتی فائدہ ضرور مدِنظر رکھا ہوگا اور نیز یہ کہ بادشاہ کے شیعہ ہوجانے سے تین بادشاہ ایک مذہب کے ہوجائیں گے یعنی شاہِ دہلی و لکھنؤ و ایران... جو خط بادشاہ نے شاہِ ایران کو لکھا میں نے نہیں دیکھا... میرے خیال میں بادشاہِ دہلی نے روپے اور فوج سے مدد مانگی ہوگی[۱]۔"

غالباً انگریزوں نے ظفر پر دباؤ ڈالا کہ وہ اس خبر کی تردید کردیں اور خود بھی اس معاملے کی تحقیق شروع کردی۔ چنانچہ ظفر نے ایک[۱] علامیہ تردید میں شائع کیا، جس میں کہا گیا کہ اُن پر جو ترکِ مذہبِ اہلِ سنّت اور اختیارِ شیعیت کی تہمت لگائی جارہی ہے اس کی بنیاد محض کذب و دروغ گوئی پر ہے۔ بادشاہ کی طرف سے جو شقہ جاری کیا گیا اس میں کہا گیا:

"آن.... اخبارِ دروغ، دروغ آرایانِ ناہنجار ضلالت شعار کہ تہمتِ ترکِ مذہبِ اہلِ سنت و اختیارِ شیعیت نسبت بحضور بستہ صد و در بعض امورِ منافیِ آئینِ دینِ اسلام را کہ خبرِ گمرہی دادند.... ایں ہمہ افتراہائے دروغِ مرزا حیدر شکوہ و مرزا نور الدین است کہ محض از راہِ حسد برائے بدنام ساختنِ حضور کردہ اند....[۲]"

دہلی کے ایجنٹ سائمن فریزر نے اودھ کے ایجنٹ کے نام خط میں لکھا ہے:

"مرزا سلیماں شکوہ بہادر کے پوتوں نے.... ایک قطعۂ شقّہ مہری خاص موسومہ مجتہد مذکور بنایا، جس میں ترکِ مذہبِ اہلِ سنّت والجماعت اور مذہبِ شیعہ کا اختیار کرنا اور امام باڑہ کی تعمیر اور ہمیشہ کو تعزیہ داری اختیار کرنا لکھا تھا۔ بندگانِ والا کو رافضی مذہب قبول کرنے سے بدنام اور متہم کیا۔ یہ سب

۱۔ چراغِ دہلی، ص ص ۲۲۴-۲۲۸

۲۔ MUTINY PAPERS - COLLECTION NO. 102 - FILE NO. [illegible]

www.paknovels.com

غلط و بے اصل اور افترا و بہتان ہے[۱]۔"

اگرچہ ظفر نے اپنے شیعی ہونے کی خبر کی تردید پُر زور الفاظ میں کی، لیکن واقعات سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ ان کا رجحان واقعی شیعی مذہب کی طرف ہوگیا تھا۔ اگرچہ بعد کو انھیں انگریزوں کے دباؤ سے اس کی تردید کرنا پڑی، ورنہ مذہب کا معاملہ اتنا نازک ہوتا ہے کہ کوئی اخبار کسی معمولی سے آدمی کے بارے میں بھی اس قسم کی غلط خبر نہیں دے سکتا۔ اور یہاں تو بادشاہِ وقت کا معاملہ تھا۔ دہلی اُردو اخبار نے ستمبر ۱۸۵۲ء اور اکتوبر ۱۸۵۲ء میں بادشاہ کے شیعی ہوجانے اور ایک مجلس تک میں شریک ہونے کی خبر چھاپی تھی۔ بظاہر یہ خبر غلط نہیں تھی ورنہ کوئی وجہ نہیں کہ اسی وقت خود بادشاہ اور تیموری شہزادے اس کی تردید نہ کرتے۔ اس وقت تک عَلَم لکھنؤ میں درگاہ عباس پر چڑھایا نہیں گیا تھا۔ تردید کافی عرصے بعد یعنی عَلَم کے چڑھانے کے بعد کی گئی۔ صاف ظاہر ہے کہ بہادر شاہ پر اس سلسلے میں کوئی غیر معمولی دباؤ ڈالا گیا تھا۔ بہادر شاہ نے صرف تردیدی اعلان ہی جاری نہیں کیا بلکہ ایک فارسی مثنوی بھی اسی مضمون کی شائع کی۔ چونکہ انگریزوں کو ڈر تھا کہ کہیں اَودھ اور دہلی متحد نہ ہوجائیں، اس لیے اس مثنوی میں خاص طور پر ایسی باتیں کہی گئیں، جن سے ظفر اور واجد علی شاہ کے باہمی تعلقات میں کشیدگی پیدا ہو۔ دستور العمل اودھ میں مشمولہ ایک خط سے پتہ چلتا ہے کہ اگرچہ یہ مثنوی بہادر شاہ ظفر کی طرف سے شائع کی گئی تھی مگر اس کے اصلی مصنف غالب تھے؛ اور اس زمانے میں یہ بات عام طور پر مشہور تھی۔

اس مثنوی کے بارے میں کچھ اور کہنے سے پہلے ضروری ہے کہ غالب اور شاہانِ اودھ کے تعلقات پر مختصر سی روشنی ڈالی جائے۔ غازی الدین حیدر کے زمانے سے غالب کی نظر دربارِ اودھ پر لگی ہوئی تھی۔ اگست ۱۸۲۶ء میں وہ کلکتہ جاتے ہوئے لکھنؤ میں ٹھہرے۔ غالب کی خواہش تھی کہ وہ نائب السلطنت نواب

۱۔ دستور العمل اودھ بحوالہ معارف، اپریل ۱۹۲۲ء، ص ص ۲۸۲-۲۸۳

www.paknovels.com

معتمد الدولہ کی خدمت میں حاضر ہوں لیکن بعض مجبوریوں کی وجہ سے اس میں کامیابی نہ ہوئی!
غالب کو نواب غازی الدین حیدر کے دربار سے کبھی کچھ نہیں ملا۔ جب نصیر الدین حیدر تخت نشین ہوئے تو ان کی شادی کی تقریب پر غالب نے ایک قطعۂ تہنیت کہہ کر بھیجا۔ کچھ عرصے بعد نصیر الدین حیدر کی مدح میں ایک اور قصیدہ لکھا۔ جو اُن تک نہ پہنچ سکا۔ شاہانِ اودھ سے غالب کے تعلقات کی مختصر داستان قاضی عبدالودود کی زبانی ملاحظہ ہو: "غالب کے ایک خاص شاگرد میکش کی رسائی لکھنؤ میں قطب الدولہ کے یہاں ہو گئی۔ غالب کو اس کا امکان نظر آیا کہ قطب الدولہ کی وساطت سے واجد علی شاہ کی خدمت میں قصیدہ پیش کر کے صلہ وصول کیا جائے۔ مگر وہ چاہتے تھے کہ کم از کم پانچ ہزار ملیں، چونکہ خود صلے کی رقم مقرر کر دینا دستور نہیں، انھوں نے یہ دکھانا چاہا کہ یہ دربارِ اودھ کا معمول ہے کہ مجھے قصیدے کا صلہ اس قدر ملے، نصیر الدین حیدر کی مدح کے قصیدے کی نسبت قطب الدولہ کو لکھتے ہیں: "از عہدِ اورنگ نشینی نصیر الدین حیدر.... بہ صیغۂ صلہ مدح زلہ خوار خوانِ عطائی آن سلطنتم۔ قصیدۂ من بوساطت روشن الدولہ بہ پیشگہہِ سلطان.... گذشتہ و پنج ہزار روپیہ مرحمت گشتہ" اس کے صراحتاً یہ معنی نکلتے ہیں کہ غالب نے صلہ پایا، ورنہ "زلہ خوار خوانِ عطا" مہمل ہو جاتا ہے۔ صلہ یابی کی اُمید منقطع ہونے لگی تو غالب نے عالمِ یاس میں میکش کو لکھا کہ میری یہ قسمت کہاں کہ صلہ ملے" "نصیر الدین حیدر مدح شنید و زر بخشید، روشن الدولہ و منشی محمد حسن پاک بخورد ند و پشیزی بمن نرسید" لیکن یہ بھی داستانِ محض ہے، نصیر الدین حیدر تک قصیدہ پہنچا ہی نہیں۔ اس صورت میں صلے کا کیا سوال ہے۔ کلیات کے ایک سے زیادہ قدیم نسخوں میں قصیدہ مذکور کا عنوان یہ ہے: ".... نگارش پذیرفتن مدح شاہ اودھ در جریدہ و بورق یادگار ماندن مدح بہ ممدوح نارسیدہ، از عالمِ مستی بیوی بادۂ ناکشیدہ" اس داستان میں بعد کو غالب نے یہ اضافہ کیا کہ اس سلسلے میں ناسخ سے مراسلت ہوئی اور

۱۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، ذکرِ غالب، ص ص ۶۴-۶۶

www.paknovels.com

انھوں نے وعدہ کیا کہ روپے روشن الدولہ کے حلق سے نکال لیں گے مگر اسے کیا کیجیے کہ اس کے بعد ہی نصیر الدین حیدر فوت ہو گئے۔ غالب یہ بھی فراموش کر گئے کہ عہدِ روشن الدولہ میں ناسخ کا وہ اثر نہ تھا کہ ایسا وعدہ کر سکتے ..... امجد علی شاہ کی مدح کے قصیدے کے متعلق غالب نے قطب الدولہ کو لکھا تھا کہ بادشاہ نے حکم دیا کہ پانچ ہزار صلہ اور اسی قدر بطور زادِ راہ غالب کو بھیجا جائے۔ لیکن قبل اس کے کہ اس پر عمل ہو' وہ اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ روپیہ نہ پایا اسی لیے نہ لکھا کہ امجد علی شاہ واجد علی شاہ کے باپ تھے اور ان کی موت کو زیادہ زمانہ نہ گذرا تھا' غالب سمجھے ہوں گے کہ اگر تحقیق ہوئی تو حقیقت معلوم ہو جائے گی۔ اس قصیدے کے بارے میں غالب نے ایک اور خط میں لکھا ہے کہ متوسط نے نوید دی کہ قصیدہ بادشاہ کی خدمت میں پیش ہوا، مگر پھر خاموش ہو گیا۔ بعد کو خبر ملی کہ اس کی رسائی بادشاہ تک ہوئی ہی نہیں۔ اس سلسلے میں خط اسی قطب الدولہ کی عبارت ذیل توجہ طلب ہے " نواب صاحب (قطب الدولہ) بآئینی شائستہ (قصیدہ را) بنظر گہہ خاقان (واجد علی شاہ) ... گذرانند و حال ثنا گستری و سخن وری من و نوازش و بخشش فردوس منزل (نصیر الدین حیدر) بعرض خسرو سپہر بارگاہ رسانند۔ اگر بخت نارسائی کند و عطیہ بقدر جاہ و دستگاہ شاہ نباشد، باری ہم بدان مایہ بخشش کہ از عہدِ فردوس منزل معمول است، قناعت میتوانم کرد[۱]"

واجد علی شاہ سے غالب کو کچھ امید باقی تھی، لیکن جب یہ مشہور ہو گیا کہ اس مثنوی کے اصلی مصنف غالب ہیں، تو یہ امید بھی ختم ہو گئی۔ خوش نصیبی سے غالب کو ایک اور موقع مل گیا۔ وہ یہ کہ کہا جاتا ہے، واجد علی شاہ کو خواب میں جناب سیّد الشہدا کی طرف سے بشارت ہوئی کہ ہم خاکِ شفا تمھارے لیے بھیجتے ہیں۔ خاکِ شفا کی ضریح بڑے تزک و احتشام سے لکھنؤ منگائی گئی۔ اس موقع پر غالب نے ایک قصیدہ کہہ کر مجتہد العصر سلطان العلما سیّد محمد صاحب کو بھیجا؛ اس کا مطلع ہے :

۱- بین الاقوامی غالب سیمینار، ص ص ۲۷-۲۹

www.paknovels.com

بیا در کربلا، تا آن ستمکش کارواں بینی
کہ در وے آدمِ آلِ عبا را ساربان بینی

سلطان العلما نے یہ قصیدہ اپنے سفارشی خط[1] کے ساتھ واجد علی شاہ کے سامنے پیش کیا۔ اسی خط سے پتہ چلتا ہے کہ اس مثنوی کے مصنف غالب تھے اور واجد علیشاہ کو یہ بات معلوم تھی۔ سید محمد کا خط ملاحظہ ہو:

"چونکہ اعلیٰ حضرت کے لیے ضریح مبارک خاکِ شفا کے پہنچنے کی خوش خبری اس دارالسلطنت سے شاہجہاں آباد کو پہنچی، اس لیے اسد اللہ خاں غالب نے جو بے مثل شاعر ہے، ایک قصیدہ مدحِ ضریح میں لکھ کر اور اعلیٰ حضرت کی ثنا گستری بھی کر کے بطریقِ ہدیۂ محقرہ کے جو بعد قبول کے تحفۂ موقرہ ہو جائے گا، حضورِ معلیٰ میں پیش کیا۔ اس لیے خاکسار نے کہ ہمیشہ نیک کاموں میں سعی کرتا ہے، دربار میں اس کو روانہ کیا۔ گر قبول افتد، زہے عزّ و شرف۔ چونکہ اس میں مرثیہ اور رُلانے والے اشعار بھی پائے جاتے ہیں، ظنِ غالب ہے کہ بفحوائے اس فقرۂ شریفہ کے کہ حدیثِ بکاد باکی میں وارد ہوا ہے (یعنی خدا اس کے گناہ کو گو وہ سمندر کے جھاگ کے برابر ہوں معاف کر دے گا) یہ پہلی

۱۔ غالب نے خود بھی اعتراف کیا ہے کہ دربارِ اودھ سے ان کا تعلق سلطان العلما کے واسطے سے قائم ہوا تھا۔ وہ یوسف مرزا کو لکھتے ہیں:

تم جانتے ہو کہ میں ۱۴ پارچے کا خلعت ایک بار، اور ملبوسِ خاص، شالی رومال، دوشالہ ایک بار پیشگاہِ حضرت سلطانِ عالم سے پا چکا ہوں۔ مگر یہ بھی جانتے ہو کہ وہ خلعت مجھ کو دو بار کس کے ذریعے سے ملا ہے یعنی جناب قبلہ و کعبہ حضرت مجتہد العصر مدظلہٗ العالی۔ اب آدمیت اس کی مقتضی نہیں ہے کہ میں بے اون کے توسط کے مدح گستری کا قصد کر دں۔ (خطوطِ غالب مرتبۂ مالک رام، ص ۴۳)

۲۔ دستور العلِ اودھ بحوالہ معارف (مئی ۱۹۲۲ء)، ص ص ۳۶۴ - ۳۶۵

www.paknovels.com

مثنوی میں اس سے جو لغزش ہو گئی ہے، وہ معاف ہو جائے گی۔ اُمید ہے کہ مدح گو ہمیشہ مورد مراحم سلطانیہ رہے گا۔"[1]

اس کے کچھ دن بعد سلطان العلما نے غالب کو لکھا:

"آپ کے خط کے جواب میں ایک معروضہ لکھ چکا ہوں، جس میں یہ اطلاع دی ہے کہ ایک معروضہ مع قصیدے کے بادشاہ سلامت کی خدمت میں بھیج دیا ہے۔ یقین ہے کہ آپ نے ملاحظہ فرمایا ہوگا۔ مگر اب تک اس کا جواب نہیں آیا۔ اس وقت قابلِ اظہار بات یہ ہے کہ قصیدہ حضور کو بہت پسند آیا اور خلعتِ فاخرہ کے عطا کرنے کا حکم صادر ہوا۔ لیکن اس خیال سے کہ آپ چونکہ خاندان صاحبقرانی سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس لیے ایسا نہ ہو کہ اس عطیہ کا بھیجنا مخالفِ مزاج اُس بادشاہ کے ہو، اس معاملے میں توقف کیا گیا۔ اب جو آپ کی رائے ہو اس پہ عمل کیا جائے[1]۔"

حالی نے بھی غالب ہی کو اس مثنوی کا مصنف قرار دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"اس مثنوی میں مرزا نے اپنی طرف سے کوئی بات نہیں لکھی تھی۔ بلکہ جو مضامین حکیم احسن اللہ خاں نے بتائے تھے، ان کو فارسی میں نظم کر دیا تھا جب یہ مثنوی لکھنؤ پہنچی تو مجتہد العصر نے مرزا سے دریافت کیا کہ آپ نے خود مذہبِ شیعہ اور مرزا حیدر شکوہ کی نسبت اس مثنوی میں ایسا اور ایسا لکھا ہے۔ مرزا نے لکھ بھیجا کہ میں ملازم شاہی ہوں، جو کچھ بادشاہ کا حکم ہوتا ہے، اس کی تعمیل کرتا ہوں۔ اس مثنوی کا مضمون بادشاہ اور حکیم احسن اللہ خاں کی طرف سے اور الفاظ میری طرف سے تصور فرمائے جائیں[2]۔"

مسعود حسن رضوی ادیب نے اس مثنوی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

۱۔ دستور العمل اودھ بحوالہ معارف مئی ۱۹۲۲ء، ص ص ۳۶۵ - ۳۶۶

۲۔ یادگار غالب، ص ۸۹

www.paknovels.com

"..... چنانچہ اس مثنوی کے جواب میں جو مثنوی کہی گئی، اس کے ایک شعر میں اس بات کی طرف اشارہ بھی کیا گیا ہے (کہ اس کے مصنف غالب ہیں) وہ شعر یہ ہے:

خصم گردد ز قہر او منکوب   گرچہ غالب بود، شود مغلوب[1] "

یہ مثنوی، جو بہادر شاہ ظفر کے نام سے شائع ہوئی اور جس کے اصل مصنف غالب ہیں، دو جگہ چھپ چکی ہے۔ اول معارف کے شمارۂ مئی ۱۹۲۲ء، (ص ص ۳۵۹-۳۶۲) اور دوسرے متفرقاتِ غالب مرتبہ سید مسعود حسن رضوی (ص ص ۱۴۵-۱۵۵) میں۔

اس مثنوی کے بارے میں مولانا امتیاز علی خاں عرشی لکھتے ہیں:

"بادشاہ کی اس عقیدت نے انھیں بہت بدنام کیا۔ تاآنکہ رائے عامہ سے مجبور ہو کر مذہب تشیع سے اپنی بریت ظاہر کرنے کے لیے مرزا غالب سے ایک فارسی مثنوی لکھوائی اور اسے چھاپ کر تقسیم کرایا۔ اس کا منظوم جواب بھی اسی زمانے میں ایک لکھنوی شیعہ شاعر نے لکھا تھا۔ رضا لائبریری رامپور میں یہ دونوں محفوظ ہیں[2]۔"

دستور العمل اودھ میں غالب کا ایک سلام بھی نقل کیا گیا ہے جس کا مطلع ہے:

سلام اسے کہ اگر بادشاہ کہیں اس کو
تو پھر کہیں کہ کچھ اس سے سوا کہیں اس کو

یہ سلام بھی متفرقاتِ غالب میں موجود ہے۔ نیز دیوان غالب مرتبہ مالک رام اور نسخۂ عرشی میں موجود ہے۔

غالب اور تیموری شہزادے

قلعے سے غالب کا تعلق اکبر شاہ ثانی کے زمانے میں ہوا تھا۔ اکبر شاہ ثانی کی

۱۔ متفرقاتِ غالب، ص ۲۳

۲۔ نوائے ادب، اپریل ۱۹۵۸ء، ص ۳۹

www.paknovels.com

مدح میں غالب کا قصیدہ ان کے کلیاتِ فارسی میں موجود ہے جس میں شہزادہ سلیم کی بھی تعریف کی گئی ہے جو ولی عہدی میں ظفر کے حریف تھے۔ بہادر شاہ ظفر سے ولی عہدی کے زمانے میں غالب کے تعلقات قائم نہ ہو سکے کیونکہ ذوق کی موجودگی میں ان کی کامیابی ممکن نہیں تھی۔ ظفر کے تخت نشین ہونے کے بعد غالب کی حیثیت محض ایک شاعر سے زیادہ نہیں تھی۔ انھوں نے کبھی کسی شہزادے کی وفات پر مرثیہ لکھا، کبھی کسی کی مدح میں شعر کہے اور کبھی کسی کی ولادت پر ظفر کو مبارک باد دی۔

مرزا شاہ رُخ

یہ ظفر کے دوسرے بیٹے تھے۔ ان کا انتقال ۹ اپریل اور ۲۳ اپریل ۱۸۴۷ء کے درمیان کسی روز ہوا تھا۔ غالب نے ان کی مدح میں یہ رباعی کہی تھی:

اے آنکہ بہ ہر نامِ تو شاہرخ است
پیوستہ تر بحضرتِ شاہ، رخ است
نازد بتو شہ کہ باشد اندر شطرنج
امیدِ ظفر قوی چو بادشاہ رخ است

اس رباعی پر تبصرہ کرتے ہوئے قاضی عبدالودود نے لکھا ہے:

"شاہرخ پسر بہادر شاہ ظفر کو بادشاہ کے انتظامی امور میں خاصا دخل تھا۔ غالب کی رباعی جو دیوان کے ایک سے زائد مخطوطات اور باغِ دودر میں بھی ہے، دیوانِ مطبوعہ سے خارج ہے۔[۱]"

باغِ دودر میں مشرف الدولہ میر ولایت علی کے نام غالب کا ایک خط ہے جس میں انھوں نے مرزا شاہ رخ کے بارے میں لکھا ہے:

"نفرینِ خدا سے برمن کہ زمیں بوس شاہزادۂ ماہ لقا، دآں ہم بیانجگری

۱۔ جہانِ غالب: شاعر (غالب نمبر ۱۹۶۹ء)، ص ۲۹

www.paknovels.com

شمار آرزو کردم۔ و ہر چند کہ ..... فروغِ گوہر ..... من ..... بدین فرو گذاشت
کہ از سوے پایہ ناشناسان بمیان آمد، از آنچہ بود نکاست، انا روائی
کہ نہ بہنجار باشد، چگونہ منتش راسزاوار باشد؟ ..... زین پیش دوبار بدان
ہمایوں نشیمن رسیدہ ام۔ و ہر دو بار زود خواندہ اند و دیر نشاندہ اند۔ حاشا کہ
دریں روش شاہزادہ طبعی باشد۔ ہمانا بیش از آنکہ من آیم قرار چناں بود کہ
یک پاس در پاسبانانم نشانند و تا شاہزادہ را بلہو نظارۂ صندوقچہ مشغول
نکنند، مرا بیش گاہ نخوانند، و چوں رو برو ی رسم حضرت صاحب عالم اساسِ
دلنوازی ننہند، مرا بہ نشستن دستوری ند ہند[۱]۔"

رباعی اور اس خط سے پتا چلتا ہے کہ غالب نے مرزا شاہ رخ سے تعلقات
قائم کرنا چاہے تھے۔ مگر نہ صرف یہ کہ آرزو پوری نہ ہوئی بلکہ شہزادے کا رویہ ان کے
ساتھ کچھ ایسا رہا کہ غالب اپنی اس آرزو پر نادم تھے۔ خط میں دو دفعہ شہزادے کی خدمت
میں حاضر ہونے کا ذکر ہے لیکن ان دونوں ملاقاتوں میں کچھ ایسی صحبت رہی کہ غالب
کے دل میں شہزادے کی طرف سے رنجش آ گئی۔ شہزادے کی موت کا ذکر کرتے ہوئے
غالب ایک خط میں لکھتے ہیں :

"مردنِ شاہرخ را سبیلِ استبعاد و استعجاب نوشتن یعنی چہ؟ مگر بدانستِ
شمار گ را بر خرداں و خسرو زادگان دست نیست! بلی، شاہرخ ہنگامِ
بازگشتن از شکار چوں نزدیکِ میرت (میرٹھ) رسید، بتخمہ رنجور شد، وہم
دراں ناحیت مرد۔ جنازۂ او را بہ شہر (دہلی) آوردند و در گلاری باغ پائینِ مزارِ
مادرش بخاکش سپردند[۲]۔"

غالب کے اس خط پر تبصرہ کرتے ہوئے قاضی عبدالودود لکھتے ہیں :

۱۔ جہانِ غالب : شاعر (غالب نمبر ۱۹۶۹ء) ص ۲۹
۲۔ باغِ دو در بحوالہ شاعر (غالب نمبر ۱۹۶۹ء) ص ۲۹

www.paknovels.com

"شاہزادوں میں ان کی اہمیت، خط میں ان کی موت پر رسمی اظہارِ رنج بھی نہیں، حال آنکہ یہ جوان اور سفر میں مرے تھے۔ اس کی وجہ کدورت ہی ہوسکتی ہے۔ رباعی (اے آنکہ بہ ہر نامِ تو شاہرخ است) کا دیوانِ مطبوعہ سے اخراج، اس کا باعث بھی یہی ہے۔ بعد کو باغِ دودر میں شمول اس وقت ہوا جب واقعہ کو بہت زمانہ گذر چکا تھا اور احساس میں شدت نہیں رہی تھی[۱]۔"

مرزا فخرو

مرزا دارا بخت سب سے بڑے بیٹے ہونے کی وجہ سے ولی عہد مقرر ہوئے تھے۔ ظفر کے دوسرے بیٹے مرزا شاہرخ اور تیسرے بیٹے مرزا کیومرث، مرزا دارا بخت کی زندگی ہی میں وفات پا چکے تھے۔ ۱۱ر جنوری ۱۸۴۹ء کو دارا بخت کا بھی انتقال ہوگیا[۲]۔ اب اصولاً مرزا فخرو کو ولی عہد بننا چاہیے تھا۔ لیکن زینت محل کی محبت میں ظفر نے جواں بخت کے لیے کوشش شروع کردی، جو ناکام رہی۔ یکم جولائی ۱۸۵۲ء کو ایک خط کے ذریعے گورنر جنرل نے بہادر شاہ ظفر کو مطلع کیا کہ حکومت برطانیہ نے مرزا فخرو کو ولی عہد تسلیم کرلیا ہے[۳]۔

غالب نے بہادر شاہ ظفر کے مقابلے میں شہزادہ سلیم کی حمایت کی تھی اور قلعے کی اس سیاست میں حصہ لینے کی سزا انھیں طویل عرصے تک ملی تھی۔ اس لیے اس دفعہ وہ محتاط رہے تھے۔ بہادر شاہ ظفر نے جوان بخت کو ولی عہد مقرر کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کی تھی۔ اس کے باوجود عام لوگوں پر انگریزوں کی پالیسی روشن تھی۔ وہ

۱- باغِ دودر بحوالہ شاعر (غالب نمبر، ۱۹۶۹ء)، ص ۲۹

۲- اسلم پرویز، ص ۱۰۵

۳- FOREIGN DEPARTENT (S.NOS-245—261) N.A.I.

www.paknovels.com

جانتے تھے کہ انگریز صرف مرزا فخرو ہی کو ولی عہد تسلیم کریں گے۔ غالب اس معاملے میں بہت لیے دیے رہے۔ انھیں ڈر تھا کہ نجانے اونٹ کس کل بیٹھے۔ اسی لیے نہ تو انھوں نے مرزا فخرو سے تعلقات قائم کیے، نہ ان کی حمایت ہی کی۔ البتہ معاملہ طے ہوگیا، تو مرزا فخرو کے ولی عہد مقرر ہو جانے پر انھوں نے ایک مدحیہ قطعہ مرزا فخرو کی خدمت میں پیش کیا۔ اس میں یہ اشعار بھی شامل ہیں:

اے کہ باشد خطِ غلامیِ من
نام آبائے من بدفترِ تو
پیش ازیں گرچہ زاقتضایِ قضا
بندہ را رہ بنود بر درِ تو
میشمردم دے زرّوی شمار
خویش را زلّہ خوار و چاکرِ تو

مرزا فخرو اُردو میں شعر بھی کہتے تھے؛ رمز تخلص تھا اور استاد ذوق سے تلمذ تھا۔ جب ۱۵ نومبر ۵۴ء میں ذوق کا انتقال ہوا، تو کچھ دن بعد مرزا فخرو نے غالب کا تلمذ اختیار کر لیا اور چار سو روپے سال غالب کے اور دس روپے ماہوار حسین علی خاں اور باقر علی خاں کے پھل کے لیے مقرر کر دیے۔ غالب نے مرزا فخرو کے لڑکے کی پیدائش پر بھی چار شعروں کا ایک قطعہ کہا تھا جو باغ دودر میں شامل ہے۔ اس کا آخری شعر یہ ہے:

گفتمش دیگر چہ گوئی، زیرِ لب خندید و گفت
ہای زاید باید افگند از "بگوہ" اینہم بگو

غالب کی بدنصیبی کہ ۱۰ جولائی ۱۸۵۶ء کو مرزا فخرو کا ہیضے سے انتقال ہوگیا۔ مرزا فخرو کے تلمذ سے غالب کو قدرے اطمینان ہو چلا تھا۔ اول تو چار سو روپے سال ان کو اور دس روپے ماہوار بچوں کو ملتا تھا اور دوسرے مستقبل میں بہت سی امیدیں تھیں غالب نے ان کی وفات پر منشی نبی بخش حقیر کو جو خط لکھا ہے۔ اس سے ان کی شخصیت کا وہ

www.paknovels.com

پہلو سامنے آتا ہے جو ساری زندگی ان کی بنیادی کمزوری بنا رہا۔ غالب لکھتے ہیں:

"یہ تم کو یاد رہے کہ ولی عہد کے مرنے سے مجھ پر بڑی مصیبت آئی۔ بس، اب مجھ کو اس سلطنت سے تعلق بادشاہ کے دم تک ہے۔ خدا جانے، کون ولی عہد ہوگا۔ میرا قدر شناس مر گیا۔ اب مجھ کو کون پہچانے گا۔ اپنے آفریدگار پر تکیہ کیے بیٹھا ہوں۔ سر دست یہ نقصان کہ وہ زین العابدین خاں کے دونوں بیٹوں کو میوہ کھانے کو دس روپے مہینا دیتے تھے۔ اب وہ کون دے گا!"[1]

پورے خط میں غالب نے کوئی ایسی بات نہیں لکھی جس سے اندازہ ہو کہ مرزا فخرو کی وفات کا غالب کو ذاتی غم تھا۔ انھیں محض یہ پریشانی تھی کہ اب نجانے کون ولی عہد ہوگا اور بچوں کو میوہ کھانے کے لیے روپے کون دے گا۔

مرزا فرخندہ شاہ

یہ بہادر شاہ ظفر کے غالباً ساتویں بیٹے تھے۔ ان کی وفات پر غالب نے ۵۴ اشعار کا مرثیہ فارسی میں کہا تھا۔ مرثیے سے معلوم ہوتا ہے کہ شہزادے کا انتقال کم عمری میں ہوا تھا۔ مثلاً یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

شاخیکہ بود موسم آتش کہ بہ دہر
از نخل عمر شاہ جدا کرد روزگار

شہزادہ خرد سال و بود روزگار پیر
شوخی بشاہزادہ چرا کرد روزگار؟

زاں سبزہ خط کہ بر رخ او نادمیدہ ماند
گردی بدل نشست و غباری بدیدہ ماند

ترکیب بند کا اختتام اس شعر پر ہوتا ہے:

۱۔ خطوطِ غالب، ص ۱۶۳

www.paknovels.com

یارب! جہاں زفیضِ تو با برگ و ساز باد
عمرِ ابوظفر شہِ غازی دراز باد

میرزا خضر سلطان خضر دہلوی

انھیں غالب سے تلمذ تھا۔[1] انھیں کی ولادت پر غالب نے یہ شعر کہا تھا:

خضر سلطاں کو رکھے خالقِ اکبر سرسبز
شاہ کے باغ میں یہ تازہ نہال اچھا ہے

۱۸۵۷ء کے انقلاب میں ان کی عمر ۲۶ سال کی تھی۔ انھیں ایک پلٹن کا افسر مقرر کیا گیا تھا۔[2] شاہی خاندان کے دوسرے افراد کے ساتھ یہ بھی ہمایوں کے مقبرے میں گرفتار ہوئے۔ ۲۳ ستمبر کو سرکاری طور پر اطلاع دی گئی کہ ہاڈسن نے بادشاہ کے دو لڑکوں مرزا مغل اور مرزا خضر سلطان کو اور ان کے پوتے مرزا ابوبکر کو جان سے مار دیا ہے۔[3]

مرزا خدا بخش قیصر

باغِ دو در اور سبدِ چین میں پانچ شعر کا ایک قطعہ ہے، اس کا پہلا اور آخری شعر یہ ہیں:

وگر در سرستم کہ از روے مستی
شرابے بساقیِ کوثر فرستم
ہمانا برآنم کہ اشعارِ خود را
بہ مرزا خدا بخش قیصر فرستم

۱- تلامذۂ غالب، ص ۱۰۲

۲- سراج الاخبار ص۹ جلد سیزدہم ۱۲ مئی ۱۸۵۷ء بحوالہ عرشی زادہ، نقوش، نومبر ۱۹۶۳ء

۳- FOREIGN DEPARTMENT 10 DEC. 1858 (S. NO. 82-125)

www.paknovels.com

صاحبِ گلستانِ سخن کا بیان ہے کہ یہ شاہ عالم کے نواسے، مرزا قادر بخش کے خالو اور مومن کے شاگرد تھے۔

۱۸۵۷ء کے انقلاب میں یہ بھی گرفتار ہوئے تھے اور جب ظفر اور شاہی خاندان کے دوسرے افراد رنگون کے لیے روانہ ہوئے، تو یہ بھی ان کے ساتھ تھے۔ لیکن الہ آباد پہنچ کر انھوں نے رنگون جانے سے انکار کر دیا۔ دہلی کے کمشنر سی۔ ایس۔ سانڈرس نے ان کے بارے میں گورنر جنرل کو لکھا:[۱]

"یہ (مرزا قیصر) بادشاہ کے چچا[۲] زاد بھائی ہیں، بالکل بے خرد۔ لیکن بہت دن تک بادشاہ کی خدمت میں حاضر رہے ہیں۔ اس لیے مناسب ہے کہ ان پر ذاتی نگرانی رکھی جائے۔ یا جب تک ہندوستان میں گڑ بڑ ہے، ان پر کم از کم نگاہ رکھی جائے۔"

کلامِ غالب اور قلعۂ معلّیٰ

(۱) فارسی کلام

پہلا قصیدہ جو غالب نے دربارِ شاہی میں پیش کیا، غالباً وہی ہے جو اکبر شاہ ثانی اور شہزادہ سلیم کی مدح میں ہے اور جو ۱۲۵۰ھ میں لکھا گیا۔ اس قصیدے کا مطلع ہے:

دریں زمانہ کہ کلکِ رصد نگارِ حکیم
ہزار و دو صد و پنجاہ راند در تقویم

غالب نے اکبر شاہ ثانی کی مدح میں غالباً صرف یہی ایک قصیدہ کہا تھا۔ بہادر شاہ ظفر کی ولی عہدی کے زمانے میں غالب نے ان کی مدح میں کوئی قصیدہ نہیں کہا۔

۱- FOREIGN DEPARTMENT 30 DEC. 1857 (No. 86)

۲- مرزا قیصر چچا زاد نہیں پھوپھی زاد بھائی تھے۔

البتہ ان کی تخت نشینی کے بعد غالب نے جو قصیدے کہے ہیں، ان میں سے پندرہ کلیاتِ غالب (فارسی) میں شامل ہیں۔ ان قصیدوں کے آغاز کے مصرعے حسب ذیل ہیں:

۱۔ زان گنجنامہ کز خطِ ساغر گرفتہ ام
۲۔ زہی ز خویش نشانِ کمالِ صنعِ الٰہ[1]
۳۔ ردیفِ شعر ازاں کردم اختیار گرہ
۴۔ گفتم، حدیثِ دوست بقرآن برابر است
۵۔ خورشید بہ بیت الشرفِ خویش در آمد[2]
۶۔ دوش در عالمِ معنی کہ ز صورت بالاست
۷۔ عیدست و نشاط و طرب و زمزمہ عامست
۸۔ دمی کہ گشت نوامندیِ تماشا را
۹۔ دیگر بدان ادا کہ وزد در بہار باد
۱۰۔ ما ہمانیم و سیہ مستیِ ہر روزہ ہمان
۱۱۔ واد کو تا ستم بر اندازد
۱۲۔ در بہاران چمن از عیش نشانی دارد
۱۳۔ رہرواں چوں گہہ آبلۂ پا بینند
۱۴۔ دریں زمانہ کہ از تارِ روزہای دراز
۱۵۔ روز بازارِ عیش اماست

۱۔ دہلی اردو اخبار کی ۱۰ اکتوبر ۱۸۵۲ء کی اشاعت میں یہ قصیدہ شامل ہے۔

۲۔ غالب کا یہ قصیدہ دہلی اُردو اخبار (۳۰ مارچ ۱۸۵۱ء) میں شائع ہوا تھا۔ اخبار نے لکھا ہے:

"نواب محمد اسد اللہ خاں صاحب المتخلص بغالب نے مدحِ بندگانِ حضور والا میں نوروز کے دن پڑھا تھا۔"

www.paknovels.com

عیدین کے قصائد

خطوطِ غالب سے اندازہ ہوتا ہے کہ بادشاہ کے استاد بننے سے قبل ہی غالب بادشاہ سے خاصے قریب آ گئے تھے۔ دوسرے ملازمین کی طرح وہ بادشاہ کے ساتھ عید کی نماز پڑھنے جاتے اور نذر پیش کرتے۔ کبھی قصیدہ نذر کے طور پر پیش کرتے اور کبھی چار روپے۔[1] ۱۸۵۰ء کے ایک خط میں غالب نے منشی نبی بخش حقیر کو لکھا ہے :

"عید کے دن بادشاہ کے ساتھ عید گاہ نہ جا سکا۔ دوسرے دن لنگ لنگاں قلعے گیا اور عید کی نذر دی"[2]

غالب کے لیے قصیدہ لکھنا بہت مشکل کام تھا۔ جس کا اظہار انھوں نے اپنے کئی خطوط میں کیا ہے۔ ایک عید کو بادشاہ بیمار پڑ گئے تو غالب نے قصیدہ بچا کر رکھ لیا تاکہ آئندہ کام آ سکے۔ لکھتے ہیں :

"عید کو بادشاہ ماندے ہوئے۔ جو کچھ کہا تھا، وہ رہنے دیا کہ کبھی پھر کام آئے گا بکرید کو کچھ کہا ہی نہیں۔ ایک رباعی پڑھ دی"[3]

جب غالب قصیدہ کہنے سے بالکل معذور ہو گئے تو عیدین کے موقع پر قطعہ یا رباعی کہہ کر پیش کرنے لگے۔ ایک دفعہ حکیم احسن اللہ خاں نے اصرار کر کے قصیدہ لکھوایا۔ اس واقعے کے بارے میں غالب لکھتے ہیں :

"میں نے قصیدہ لکھنا موقوف کیا۔ موقوف کیا کیا۔ مجھ سے لکھا ہی نہیں جاتا۔ قطعہ یا رباعی عیدین کو لکھ کر نذر کر دیتا تھا۔ اب کے حکیم صاحب (حکیم احسن اللہ خاں)

۱۔ ایک خط میں غالب منشی نبی بخش حقیر کو لکھتے ہیں: "عید کی مثنوی صرف روپے بچانے کی تھی۔ یعنی اگر وہ نہ ہوتی تو مجھ کو چار روپے دینے پڑتے" (نادراتِ غالب، ص ۸۱)

۲۔ نادراتِ غالب، ص ص ۵-۶

۳۔ ایضاً، ص ص ۴۸-۴۹

www.paknovels.com

نے بہت شدت کی اور کہا کہ صاحب یہ تو نذرِ عید نہ ہوئی جیسے معلم لڑکوں کو عیدی کے دو شعر لکھ دیتے ہیں۔ یہ ویسی عیدی ہے۔ ناچار میں نے یہ مثنوی[1] کی روش پر چالیس بیالیس بیت لکھ کر نذر کر دی"[2]

مالک رام صاحب نے جب مطبوعہ کلیاتِ غالب کا آزاد لائبریری علی گڑھ کے ایک قلمی نسخۂ کلیاتِ غالب سے موازنہ کیا، تو معلوم ہوا کہ مطبوعہ نسخے میں پانچ قصیدے ایسے ہیں جن کے ممدوح پہلے بہادر شاہ ظفر تھے لیکن بعد کو غالب نے ان قصیدوں میں ضروری ترمیم و تنسیخ کر کے انھیں دوسرے ممدوحین سے منسوب کر دیا۔ مطبوعہ نسخے میں ایک قصیدہ ہے:

در روزگار ما نتواند شمار یافت
خود روزگار آنچہ دریں روزگار یافت[3]

اس کا عنوان ہے "سی ام قصیدہ در مدحِ شہنشاہِ انگلستان"۔ لیکن آزاد لائبریری کے نسخے میں اس کا عنوان ہے "در تہنیتِ غسلِ صحت حضورِ اقدس"۔ مطبوعہ کلیات میں ایک

۱۔ کلیاتِ نظمِ فارسی میں ایک مثنوی بعنوان "تہنیتِ عیدِ شوال" ہے۔ اس بیالیس اشعار کی مثنوی کا مطلع ہے:

باز برانم کہ بہ دیباے راز
از اثر ناطقہ بندم طراز

غالب کا اشارہ اسی مثنوی کی طرف معلوم ہوتا ہے۔

۲۔ نادراتِ غالب، ص ۸۰

۳۔ قاضی عبدالودود بھی اس قصیدے کے بارے میں لکھتے ہیں "یہ قصیدہ جیسا کہ بعض مجموعۂ اشعارِ غالب سے ثابت ہے، انطباعِ دستنبو سے کئی سال قبل اس موضوع پہ کہا گیا تھا، جب بہادر شاہ نے ایک سخت مرض میں مبتلا ہو کر غسلِ صحت کیا تھا۔"

(بین الاقوامی غالب سمینار، ص ۴۲)

www.paknovels.com

اور قصیدہ سر جارج فریڈرک اڈمنسٹن کی مدح میں ہے اس کا مطلع ہے :

بازپیغامِ بہار آورد باد
مژدہ بہرِ روزگار آورد باد

لیکن آزاد لائبریری کے خطی نسخے میں اس کا عنوان "در تہنیتِ نوروز" ہے اور یہ بہادر شاہ ظفر کی مدح میں ہے۔ بقول مالک رام صاحب نسخۂ علائی سے پتہ چلتا ہے کہ غالب نے یہ قصیدہ ۱۸۵۵ء میں نوروز کی تقریب پر لکھا تھا۔ مطبوعہ کلیات میں ایک اور قصیدے کا مطلع ہے :

خیز تا بنگری بشاخِ نہال
طوطیانِ زمردیں تمثال

اور یہ جان رسل کالون کی مدح میں ہے اور اس قصیدے کی بیتِ اسم ہے

اسکوئر کالون کہ درگاہش
اہلِ دل راست کعبۂ آمال

بقول مالک رام صاحب "نواب علائی والے نسخے میں پہلا مصرع تبدیل کیا گیا ہے پہلے کچھ اور تھا۔ اسے چھیل کر خود غالب نے اس کے اوپر یہ مصرع لکھا ہے۔ لہٰذا نیچے کا مصرع پڑھا نہیں جاتا۔ دوسرے مصرعے کے تیور کچھ ایسے ہیں کہ اگر یہ بھی دراصل بہادر شاہ ظفر ہی کی مدح میں ہو، تو تعجب نہیں کرنا چاہیے!

اسی طرح مطبوعہ نسخے میں ایک قصیدہ نواب وزیر الدولہ بہادر والی ٹونک کی مدح میں ہے۔ جس کا مطلع ہے :

عید الضحیٰ بسر آغاز زمستاں آمد
وقت آراستن مجرۂ دا پواں آمد

مالک رام صاحب کا شبہہ ہے کہ یہ بھی پہلے بہادر شاہ ظفر کی مدح میں لکھا

۱۔ نقوش (مارچ ۱۹۶۳ء)، ص ۲۷

www.paknovels.com

گیا تھا۔

ایک قصیدہ مطبوعہ کلیات میں مہاراجہ نرندر سنگھ والیِ پٹیالہ کی مدح میں ملتا ہے۔
اس کا مطلع ہے:

سحر کہ بادِ سحر عرضِ بوستاں گیرد
دہد بہ نکہتِ گل حکم تا جہاں گیرد

اس قصیدے کا عنوان قلمی نسخے میں یوں ہے:

"در مدحِ حضرت سراج الدین محمد بہادر شاہِ غازی خلد اللہ سلطنتہ"

عنوان "دستنبو" کے تحت آیندہ اوراق میں صراحت کی جائے گی کہ غالب نے دورانِ انقلاب تین قصیدے بہادر شاہ ظفر کی مدح میں کہے تھے۔ ایک ۲۶ مئی ۱۸۵۷ء کو عید کے موقع پر، دوسرا ۱۳ جولائی ۱۸۵۷ء کو آگرے کی فتح کی خوشی کے موقع پر، اور تیسرا ۱۱ اگست ۱۸۵۷ء کو۔ ان تینوں قصیدوں کا سراغ نہیں ملتا۔ لیکن اس کا تو یقین ہے کہ غالب نے انھیں ضائع نہیں کیا ہوگا؛ ترمیم و تنسیخ کر کے ممدوحین بدل دیے ہوں گے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ غالب نے بہادر شاہ ظفر کی مدح میں کم از کم ۲۳ قصیدے ضرور کہے۔ پندرہ وہ جو مطبوعہ کلیات میں شامل ہیں، پانچ وہ جن کے بعد میں عنوان بدل دیے اور تین وہ جو زمانۂ انقلاب میں بادشاہ کی خدمت میں پیش کیے۔

اس کے علاوہ شہزادہ جواں بخت کی شادی پر غالب نے ایک قطعۂ تہنیت بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ اس کا پہلا شعر ہے:

بہار در چمن اندازِ گل فشانی کرد
بشاخِ نخلِ تمنا ثمر مبارک باد

اسی طرح ایک اور قطعہ ہے:

اے کہ در بزمِ شہنشاہِ سخن رس گفتہ
کے بہ ہر گوییِ فلاں در شعر ہمسنگِ منست

www.paknovels.com

اگرچہ اس قطعہ میں مخاطب بہادر شاہ ظفر نہیں، بلکہ غالب کا کوئی حریف ہے لیکن جس انداز سے ظفر کا ذکر آیا ہے، اس سے خیال ہوتا ہے کہ شاید یہ قطعہ ظفر کے سامنے پڑھا گیا تھا۔ غالب نے ظفر کی مدح میں ایک ترجیع بند بھی کہا تھا، جس کا مطلع ہے :

باز برانم کہ نیاز آورم

ان قصائد و قطعات کے علاوہ کلیات میں دو مثنویاں بھی شامل ہیں، جو بہادر شاہ ظفر کی مدح میں کہی گئی تھیں۔ ایک مثنوی کا عنوان ہے "سرمۂ بینش"۔ اور اس کا مطلع مثنوی مولانا روم سے مستعار لیا ہے۔

بشنو از نے ،چوں حکایت میکند
از جدائیہا شکایت میکند

دوسری مثنوی کا عنوان ہے "تہنیتِ عیدِ شوال" اور اس کا مطلع ہے :

باز برانم کہ بہ دیبای راز
از اثرِ ناطقہ بندم طراز

غالب نے ایک فارسی غزل بھی بہادر شاہ ظفر کی مدح میں کہی تھی۔ اس کا مطلع ہے :

شاہا بہ بزمِ جشنِ چو شاہاں خراب خواہ
زر بیحساب بخش و قدح بیحساب خواہ

جیسا کہ اوپر ذکر ہوا، میرزا فرخندہ شاہ کی وفات پر غالب نے ایک ترکیب بند مرثیہ کہا تھا جس کا مطلع ہے :

اے دل ! بچشمِ زخمِ حوادث نگار شو
اے چشم ! از طراوشِ دل اشکبار شو

ظفر کی شخصیت کے تحت اس مثنوی کا ذکر کیا جا چکا ہے، جو ظفر کے نام سے شائع ہوئی تھی، لیکن جس کے اصل مصنف غالب تھے۔

میرزا فتح الملک بہادر غلام فخرالدین عرف مرزا فخرو ولی عہد بہادر شاہ کی مدح

www.paknovels.com

میں غالب کے تین قصیدے کلیاتِ غالب میں شامل ہیں۔ ان کے پہلے مصرعے حسبِ ذیل ہیں۔

۱۔ دادرِ سلطان نشان آید ہمی

۲۔ زہے بتانِ مغان شیوہ دادخواہانش[1]

۳۔ بازم نفس از سینہ بہ ہنجار بر آمد

مطبوعہ کلیات میں ملکہ وکٹوریہ کی مدح میں ایک قصیدہ ہے، جس کا مطلع ہے:

شکر کہ آشوبِ برف و بادِ سحر آمد

نامیہ از بندِ زمہریر بر آمد

یہ بھی پہلے مرزا فخرو کی مدح میں تھا۔ تین شعروں میں ترمیم کر کے غالب نے ممدوح کا نام بدل دیا[2]۔ گویا مرزا فخرو کی مدح میں چار قصیدے ہو گئے۔ اس کے علاوہ ان کی مدح میں دو قطعات بھی ہیں، جن کے مطلعے حسبِ ذیل ہیں:

جم حشم شاہزادہ فتح الملک

مرحبا، طالعِ منظفر تو!

دی بہنگامۂ ہنگامِ فرودرفتنِ مہر

روی ابروی نمود از افقِ چرخِ ہلال

کلیاتِ غالب میں ایک مثنوی کا عنوان ہے " در تہنیتِ عید بہ ولی عہد" اس کا مطلع ہے:

منکہ دریں دائرۂ لاجورد

کردہ ام از حکم ازل آبخورد

فارسی نثر میں غالب نے خاندانِ تیمور کی تاریخ مہر نیم روز بہادر شاہ ظفر کے حکم سے لکھی تھی۔ اس کا تفصیلی ذکر کیا جا چکا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے ایک

۱۔ یہ قصیدہ غالب نے ۱۸۵۳ء میں پیش کیا تھا۔ ملاحظہ ہو، خطوطِ غالب (مرتبہ مالک رام، ص ۱۴۳)

۲۔ نقوش، مارچ ۱۹۶۳ء، ص ۲۵۔

www.paknovels.com

شہزادے مرزا رحیم الدین بہادر حیا کے دیوان پر ایک دیباچہ لکھا تھا، جو کلیاتِ نثر (ص ص ۸۰۷-۸۰۰) میں شامل ہے اور مطبوعہ دیوان کے شروع میں بھی موجود ہے۔

(ب) اُردو کلام

دیوانِ غالب (اُردو) میں مندرجہ ذیل کلام بہادر شاہ ظفر کی مدح میں ملتا ہے:

قصائد

۱- ہاں مہ نو، سنیں ہم اس کا نام
۲- صبحدم دروازۂ خاور کھلا

قطعات

۱- اے شہنشاہ فلک منظر بے مثل و نظیر!
۲- اے شہنشاہِ آسماں اورنگ[۱]!
۳- اے شاہِ جہانگیر جہاں بخشِ جہاں دار!
۴- ہے چار شنبہ آخرِ ماہِ صفر، چلو
۵- پھر اس انداز سے بہار آئی[۲]

رباعی

ہیں شہ میں صفاتِ ذوالجلالی باہم

جواں بخت کی شادی پر غالب نے جو سہرا کہا، اور پھر معذرت میں جو قطعہ کہا گیا تھا اس کا تفصیلی ذکر کیا جا چکا ہے۔

غزلیات

دیوانِ غالب میں کم سے کم دو غزلیں ایسی ہیں جن کے بعض اشعار کے مخاطب

۱- یہ قطعہ جنوری ۱۸۵۱ء میں پڑھا گیا تھا۔ اس کا تفصیلی ذکر "مہر نیم روز" کے تحت کیا جا چکا ہے۔

۲- غالب کا یہ قطعۂ تہنیت دہلی اُردو اخبار کی ۳ دسمبر ۱۸۵۲ء کی اشاعت میں شامل ہے۔ یہ بادشاہ کے غسلِ صحت کے موقع پر پڑھا گیا تھا۔

www.paknovels.com

محبوب نہیں، بہادر شاہ ظفر معلوم ہوتے ہیں۔

۱۔ دائم پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں

۲۔ ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ "تو کیا ہے"؟

غزل کے بعض اشعار میں غالب نے ظفر کی مدح کی ہے۔ مثلاً

۱۔ قفس میں ہوں، گر اچھا بھی نہ جانیں میرے شیون کو
مرا ہونا بُرا کیا ہے، نوا سنجانِ گلشن کو
مرے شاہِ سلیماں جاہ سے نسبت نہیں، غالب!
فریدون و جم و کیخسرو و داراب و بہمن کو

۲۔ تم جانو، تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو
مجھ کو بھی پوچھتے رہو، تو کیا گناہ ہو!
غالب بھی گر نہ ہو، تو کچھ ایسا ضرر نہیں
دنیا ہو یا رب! اور مرا بادشاہ ہو!

غالب کی ایک غزل ہے

۳۔ شکوے کے نام سے بے مہر خفا ہوتا ہے
یہ بھی مت کہہ کہ جو کہیے، تو گلا ہوتا ہے

اس غزل میں پانچ اشعار بادشاہ کی مدح میں ہیں۔

۴۔ خضرِ سلطاں کو رکھے، خالقِ اکبر سرسبز
شاہ کے باغ میں یہ تازہ نہال اچھا ہے

۵۔ غالب! گر اس سفر میں مجھے ساتھ لے چلیں
حج کا ثواب نذر کروں گا حضور کی[1]

۱۔ اگرچہ اس میں بادشاہ کا نام نہیں لیا گیا، لیکن یہاں "حضور" سے مراد محبوب نہیں؟ بادشاہ ہی ہو سکتا ہے۔

www.paknovels.com

۶- غالب! نہ کر حضور میں تو بار بار عرض
ظاہر ہے تیرا حال سب اُن پر کہے بغیر
۷- شاہ کے، ہے غسلِ صحت کی خبر
دیکھیے، کب دن پھریں حمام کے
۵- غالب نے ایک مقطع میں ظفر کا ایک مصرع اس طرح تضمین کیا ہے۔
مجھے جنوں نہیں غالب، وے بقولِ حضور
"فراق یار میں تسکین ہو تو کیوں کر ہو[۱]"
۶- اُردو دیوان میں غزل کے تین ایسے اشعار بھی ہیں جن میں ظفر کی مدح ہے۔ مطلع کا پہلا مصرع ہے:
رندی ہوئی ہے گو کبہ شہر یار کی
کم از کم دو غزلوں کے مطلعوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ قلعے کے ایسے مشاعروں میں پڑھی گئیں جو بہادر شاہ ظفر کی فرمایش پر منعقد ہوئے اور ممکن ہے کہ وہ خود بھی ان میں موجود رہے ہوں۔ ان غزلوں کے پہلے مصرعے یہ ہیں:
۱- بزمِ شاہنشاہ میں اشعار کا دفتر کھلا
۲- حضورِ شاہ میں اہلِ سخن کی آزمایش ہے
اب وہ غزلیں دیکھیے، جو غالب نے دربار شاہی یا قلعے کے مشاعرے میں پڑھی تھیں۔ بعض مآخذ سے ان غزلوں کے سنہ تصنیف کا بھی تعین ہو جاتا ہے۔
غالب نے ۲۲ فروری ۱۸۴۸ء کے ایک فارسی خط میں منشی نبی بخش حقیر کو لکھا ہے کہ کل تیموری شہزادوں میں سے ایک نے بزمِ مشاعرہ منعقد کی تھی اور شاعروں کو

۱- ظفر کی غزل کا مطلع ہے:
نصیب وصل تمھارا، کہو تو، کیونکر ہو — فراقِ یار میں تسکین ہو، تو کیونکر ہو
(کلیاتِ ظفر، ۴، ص ۱۰۹)

www.paknovels.com

غزلخوانی کی دعوت دی تھی، مجھے اب شعر کہنے کا دماغ تو رہا نہیں، نہ طبیعت اس طرف مائل تھی مگر بندگی بیچارگی۔ چنانچہ خاص اس روز جب اس جلسے میں جانا تھا، بلکہ عین اس وقت جب پالکی میں بیٹھا، مشاعرے میں شرکت کے لیے جا رہا تھا، چند اشعار بے طلب ذہن میں وارد ہوئے، وہ بھیج رہا ہوں اور یہ چاہتا ہوں کہ تم بھی اس زمین میں غزل لکھ کر مجھے بھیجو۔

غالب نے جو غزل نقل کی ہے، اس کا مطلع ہے:

ذکر اس پری وش کا، اور پھر بیاں اپنا
بن گیا رقیب آخر، تھا جو رازداں اپنا[۱]

ظاہر ہے کہ یہ غزل ۱۸۴۸ء میں لکھی گئی تھی۔

غالب نے ۱۸۵۱ء کے ایک خط میں منشی نبی بخش حقیر کو لکھا ہے:

"ایک بات تم کو یہ معلوم رہے کہ جب حضور میں حاضر ہوتا ہوں تو اکثر بادشاہ مجھ سے ریختہ طلب کرتے ہیں۔ سو وہ کہی ہوئی غزلیں تو کیا پڑھوں۔ نئی غزل کہہ کرلے جاتا ہوں۔ آج میں نے دوپہر کو ایک غزل لکھی ہے کل یا پرسوں جاکر پڑھوں گا۔ تم کو بھی لکھتا ہوں[۲]۔"

اس کے بعد وہ غزل نقل کی ہے، جس کا مطلع ہے:

کہتے تو ہو تم سب کہ بتِ غالیہ مُو آئے
اک مرتبہ گھبرا کے کہو کوئی کہ وُو آئے[۳]

جو کلام قلعے کے مشاعروں یا دربارِ شاہی میں پڑھا جاتا تھا، اسے دہلی اردو اخبار اہتمام سے شائع کرتا تھا۔ اس سلسلے میں غالب کی بھی کچھ غزلیں دہلی اُردو اخبار میں شائع

۱۔ تلاشِ غالب، ص ص ۱۳۴ - ۱۳۵

۲۔ نادراتِ غالب، ص ۲

۳۔ دہلی اُردو اخبار نے ۱۸ مئی ۱۸۵۱ء کی اشاعت میں یہ غزل شائع کی ہے۔

www.paknovels.com

ہوئی ہیں۔ یہاں دہلی اُردو اخبار کے ان شماروں کی تاریخیں اور شائع شدہ غزلیات کی نشاندہی کی جاتی ہے:

فروری ۱۸۵۳ء: دل ہی تو ہے، نہ سنگ وخشت، درد سے بھر نہ آئے کیوں!

۱۶ مارچ ۱۸۵۳ء: گئی وہ بات کہ ہو گفتگو، تو کیونکر ہو

۱۷ اپریل ۱۸۵۳ء: گھستے گھستے، پانوں میں زنجیر، آدھی رہ گئی!

۲۴ اپریل ۱۸۵۳ء: دیا ہے دل اگر اس کو، بشر ہے، کیا کہیے!

۸ مئی ۱۸۵۳ء: قفس میں ہوں، گر اچھا بھی نجانیں میرے شیون کو

۲۲ مئی ۱۸۵۳ء: بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے

۱۹ جون ۱۸۵۳ء: ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے

۲۸ اگست ۱۸۵۳ء: سب کہاں، کچھ لالہ وگل میں نمایاں ہوگئیں

اردو نثر میں غالب نے بہادر شاہ ظفر کی ایک کتاب پر تقریظ لکھی تھی۔ یہ کتاب ظفر کے شیعی مذہب اختیار کرنے کی تردید میں ہے اور خود ظفر کی طرف سے شائع ہوئی تھی۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ اس کا اصل مصنّف کون تھا۔ بہرحال یہ تقریظ خطوطِ غالب مرتّبہ مہر میں شامل ہے۔

غالب کی ایک رباعی ہے:

بھیجی ہے مجھے شاہِ جمجاہ نے دال
ہے لطف و عنایاتِ شہنشاہ پہ دال
یہ شاہ پسند دال، بے بحث و جدال
ہے دولت و دین و دانش و داد کی دال

اس کے بارے میں حالی نے لکھا ہے:

"بادشاہ کے ہاں مونگ کی دال پکا کرتی تھی، جو بادشاہ پسند کہلاتی تھی۔

۱۔ یہ مخمس ہے جس میں ظفر کی ایک غزل تضمین کی گئی ہے۔

www.paknovels.com

یہ رباعی اسی کے شکریے میں لکھی گئی ہے[1]۔"

غالب بعض موقعوں پر بادشاہ کی خدمت میں قصیدہ گزارنے کی بجائے محض قطعہ یا رباعی یا چند شعر پیش کر دیا کرتے تھے۔ ایک ایسی ہی رباعی یہ ہے:

حق شہ کی بقا سے خلق کو شاد کرے
تا شاہ شیوعِ دانش و داد کرے
یہ دی جو گئی ہے رشتۂ عمر میں گانٹھ
ہے صفر کہ افزایشِ اعداد کرے

ایک قطعہ کے بارے میں حالی نے لکھا ہے:

"جب بادشاہ کوئی عمدہ چیز پکواتے تھے، تو اکثر مصاحبین اور اہلِ دربار کے لیے بطورِ تُوش کے بھیجا کرتے تھے۔ اس کے شکریے میں کبھی کبھی مرزا کوئی قطعہ یا رباعی بادشاہ کے حضور گزرانتے تھے۔ یہ قطعہ بھی اسی قبیل کا ہے:

نہ پوچھ اس کی حقیقت، حضورِ والا نے
مجھے جو بھیجی ہے، بیسن کی روغنی روٹی
نہ کھاتے گیہوں، نکلتے نہ خلد سے باہر
جو کھاتے حضرتِ آدم یہ بیسنی روٹی[2]"

حالی لکھتے ہیں:

"بادشاہ نے سیم کے بیجوں کا سالن بھیجا ہے۔ اس کے شکریے میں یہ رباعی لکھی ہے:

ان سیم کے بیجوں کو کوئی کیا جانے
بھیجے ہیں جو ارمغاں شہِ والا نے
گن کر دیویں گے ہم دعائیں سو بار
فیروزے کی تسبیح کے ہیں یہ دانے[3]"

۱- یادگارِ غالب، ص ۱۹۴
۲- ایضاً، ص ۱۹۲
۳- ایضاً، ص ۱۹۶

www.paknovels.com

غالب نے ایک دفعہ مسہل لیا۔ اس لیے قلعے نہ جا سکے۔ اس پر بقولِ حالی:

"(غالب نے) یہ قطعہ دربار کی غیر حاضری کے عذر میں لکھا ہے:

سہل تھا مسہل، ولے یہ سخت مشکل آپڑی
مجھ پہ کیا گزرے گی اتنے روز، حاضر بن ہوئے
تین دن مسہل سے پہلے، تین دن مسہل کے بعد
تین مسہل، تین تبریدیں، یہ سب کے دن ہوئے[۱]"

غالب کی ایک رباعی ہے:

جن لوگوں کو ہے مجھ سے عداوت گہری
کہتے ہیں مجھے وہ رافضی اور دہری
دہری کیوں کر ہو، جو کہ ہووے صوفی؟
شیعی کیوں کر ہو، ماوراء النہری؟

حالی نے اس کے بارے میں لکھا ہے:

"ایک بار مرحوم بہادر شاہ نے دربار میں کہا کہ ہم نے سنا ہے کہ مرزا اسد اللہ خاں غالب شیعی المذہب ہیں۔ مرزا کو بھی اطلاع ہوگئی۔ چند رباعیاں لکھ کر حضور کو سنائیں، جن میں تشیع اور رفض سے تحاشی کی تھی۔ ان میں سے ایک رباعی جو بہت لطیف ہے، مجھ کو یاد رہ گئی ہے[۲]۔"

مولانا حالی نے یادگارِ غالب میں اس موقع کی ایک ہی رباعی دی ہے جو انھیں یاد رہ گئی تھی۔ حسنِ اتفاق سے اس سلسلہ کی باقی چار رباعیاں سراج الاخبار کے جس شمارے میں شائع ہوئی تھیں، وہ بھی دستیاب ہوگیا ہے[۳]۔

۱۔ یادگارِ غالب، ص ۱۹۳

۲۔ ایضاً، ص ۸۷

۳۔ سراج الاخبار ۸: ۲۸ (۱۶ نومبر ۱۸۵۰ء) بحوالہ عرشی زادہ، ضمیمہ نسخہ عرشی، نقوش نومبر ۱۹۶۴ء

www.paknovels.com

اصحاب کو جو ناسزا کہتے ہیں
سمجھیں تو ذرا دل میں کہ کیا کہتے ہیں
سمجھا تھا نبی نے اون کو اپنا ہمدم
ہے ہے، نہ کہو! کسے بُرا کہتے ہیں

یارانِ رسول یعنی اصحابِ کبار
ہیں گرچہ بہت، خلیفہ ان میں ہیں چار
ان چار میں ایک سے ہو جس کو انکار
غالب! وہ مسلمان نہیں ہے، زنہار!

یارانِ نبی میں تھی لڑائی کس میں؟
الفت کی نہ تھی جلوہ نمائی کس میں؟
وہ صدق، وہ عدل، وہ حیا، وہ علم
بتلاؤ کوئی کہ تھی برائی کس میں؟

یارانِ نبی سے رکھ تولا، باللہ!
ہر یک ہے کمالِ دیں میں یکتا، باللہ!
وہ دوست نبی کے اور تم اون کے دشمن
لَاحَولَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا باللہ!

سراج الاخبار کی اسی اشاعت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ رباعیاں کب کہی گئی تھیں۔
غالب نے منشی نبی بخش حقیر کو خط میں درجِ ذیل قطعہ اور رباعی لکھی ہیں۔

آرام کے اسباب کہاں سے لاؤں
سامانِ خورد و نوش کہاں سے لاؤں
روزہ مرا ایمان ہے، غالب! لیکن
خسخانہ و برف آب کہاں سے لاؤں

افطارِ صوم کی جسے کچھ دستگاہ ہو
اس شخص کو ضرور ہے، روزہ رکھا کرے
جس پاس روزہ کھول کے، کھانے کو کچھ نہ ہو
روزہ اگر نہ کھائے تو ناچار کیا کرے

اور پھر ان کے بارے میں لکھا ہے:

www.paknovels.com

"یہ رباعی اور قطعہ کل حضور میں پڑھا تھا؛ بہت ہنسے اور خوش ہوئے۔"
غالب نے مغل حکومت کے زوال کے بارے میں ایک قطعہ اور ایک شعر کے علاوہ اور کچھ کہا ہو تو میرے علم میں نہیں۔ قطعہ ہے:

مسلمانوں کے میلوں کا ہوا قتل
پچھے ہے جوگ مایہ اور دیہی
نشاں باقی نہیں اب سلطنت کا
مگر، ہاں نام ہے اورنگ زیبی

شعر یہ ہے:

بادشاہی کا جہاں یہ حال ہو، غالب! تو پھر
کیوں نہ دلّی میں ہر اک ناچیز نوّابی کرے

ظفر کی شعرگوئی اور غالب

تاریخِ ادب اُردو کے طالب علم ایک طویل عرصے تک کلامِ ظفر کو ذوق کی دین سمجھتے رہے۔ ظفر پر اس ستم ظریفی کی ابتدا ذوق کے چہیتے شاگرد مولانا محمد حسین آزاد نے کی تھی۔ لیکن پچھلے پچیس تیس برسوں میں جب اُردو نقادوں نے کلامِ ظفر کا غیر جانبدارانہ مطالعہ کیا تو بیشتر حضرات اس نتیجے پر پہنچے کہ ظفر کے کلام پر ان کے اساتذہ کی اصلاح ضرور ہے لیکن اس کے خالق خود ظفر ہیں۔ خود ظفر کے معاصرین نے کلامِ ظفر کی تعریف کی ہے۔[۱]

۱۔ سرور لکھتے ہیں: "ازاں بالاتر است کہ در خیال آرد۔ اکثر تصانیفش ناخن زن دلہا است۔" (عمدۂ منتخبہ، ص ۱۱۴)۔ خوب چند ذکا لکھتے ہیں: "بہ ترقیم بعضے اشعارِ آبدار کہ ہر یکے ازاں در ثمین دریائے سخن است مے پردازد۔" (عیار الشعرا، ص ۲۴۴)۔ نواب شیفتہ نے لکھا ہے: "شیخ ابراہیم ذوق از ماندہ نعمتش ذلہ ربا و وظیفہ خوار است و افکارِ ایشاں بحکُ اصلاحِ او درست و (ص ۵، پر)

www.paknovels.com

ذوق کی وفات پر دہلی اُردو اخبار میں ان پر ایک مقالہ چھپا تھا۔ جس میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ :

" (ذوق) ان کی توجہات سے شاگردوں کے دیوان کئی جلدوں میں مرتب ہو گئے، لیکن طرفہ تر یہ کہ اپنا دیوان مرتب نہیں کیا۔ اگر کسی نے احباب و تلامذہ میں سے تکلیف جمعیت دی بھی تو ہنس کر ٹال دیا اور کہا تو یہ کہا حضور والا کا دیوان مقدم ہے[1]۔"

یہ گویا بالواسطہ طور پر ظفر پر پہلی چوٹ تھی۔ "دیوان کئی جلدوں میں مرتب ہو گئے۔" یا "حضور والا کا دیوان مقدم ہے" کا جو مطلب ہے وہ اہل نظر سے پوشیدہ نہیں ہے۔ اس سے پہلے اسپرنگر نے یہ بات کہی تھی[2]۔ کچھ عرصے بعد جب ذوق اور ظفر دونوں ہی باقی نہیں رہے تو استاد کی عقیدت میں محمد حسین آزاد نے آب حیات میں لکھا :

" بہادر شاہ کے چار دیوان ہیں۔ پہلی کچھ غزلیں شاہ نصیر کی اصلاحی ہیں اور کچھ کاظم حسین بے قرار کی۔ غرض پہلا دیوان نصف سے زیادہ اور باقی تین دیوان سر تا پا حضرت مرحوم ذوق کے ہیں۔ جن سنگلاخ زمینوں میں قلم کو چلنا مشکل ہے۔ ان کا نظام اور سرانجام اس خوبصورتی سے کیا کہ دل شگفتہ

(ص ۷۴، سے آگے) ہموار، (گلشن بیخار، ص ۱۲۹) مولوی کریم الدین کلام ظفر کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں "شعرا ایسا کہتے ہیں کہ ہمارے زمانے میں ان کے برابر کوئی نہیں کہہ سکتا۔ ابراہیم ذوق سے اصلاح لیتے ہیں۔ . . . تمام ہندوستان میں اکثر قوال اور رنڈیاں ان کی غزلیں اور گیت ٹھمریاں گاتی ہیں۔ ہر ایک قسم کے شعر کہنے کی ان کو قدرت ہے۔" (طبقات الشعرائے ہند، معاصر، پٹنہ، ص ۵۱)

۱۔ دہلی اُردو اخبار، ۱۸ نومبر ۱۸۵۴ء

۲۔ اشپرنگر نے یادگار شعرا میں لکھا ہے "ظفر۔ میرزا ابوظفر شاہ دہلی ایک دیوان کے مصنف ہیں جو اصل میں ذوق کا کہا ہوا ہے۔" (یادگار شعرا ص ۱۳۳)

www.paknovels.com

ہوتے ہیں۔ والد مرحوم کہا کرتے تھے کہ بادشاہ تمہارا زمین کا بادشاہ ہے۔ طرحیں خوب نکالتا ہے مگر تم سرسبز کرتے ہو۔ ورنہ شورزار بن جائے۔ مسودۂ خاص میں کوئی شعر پورا، کوئی ڈیڑھ مصرعہ، کوئی ایک، کوئی آدھا مصرعہ، فقط بحر اور ردیف و قافیہ معلوم ہو جاتا تھا۔ باقی بخیر۔ ذوق ان ہڈیوں پر گوشت پوست چڑھا کر حسن و عشق کی پتلیاں بنا دیتے تھے۱۔"

ذوق کی ایک غزل ہے جس کا مطلع ہے۔

ہم سے ظاہر و پنہاں جو اس غارت گر کے جھگڑے ہیں
دل سے دل کے جھگڑے ہیں، نظروں سے نظر کے جھگڑے ہیں

اس غزل کی تمہید کے طور پر مولانا محمد حسین آزاد نے لکھا ہے:

"حکیم احسن اللہ خاں طبیب شاہی تھے اور بڑے مقرب تھے۔ انہی کے پاس بادشاہ کی غزلیں جمع ہوا کرتی تھیں۔ وہی دیوانِ ظفر ترتیب دیتے تھے اور مرتب کر کے چھپواتے تھے۔ مطبع سلطانی انہی کے اہتمام میں تھا۔ سخن کے جوہر شناس تھے۔ استاد کا کلام بھی شوق سے لکھوا لیتے تھے۔ انھیں یہ غزل بہت پسند تھی۔ حضور کے سامنے ان ہی کی زبان سے نکل گئی تھی۔ حکیم کلام کی محبت سے استاد سے محبت رکھتے تھے۔ مگر خلیفہ صاحب (ذوق کے لڑکے محمد اسمٰعیل) کے سبب کھٹکتے تھے۔ خیال تھا کہ حضور پھر انھیں خدمتیں سپرد نہ کر دیں۔ ان کے سامنے حکیم صاحب کے اختیار ضعیف ہو جاتے تھے اسی لیے مرزا نوشہ (غالب مرحوم) کو حضور میں پہنچایا تھا حالانکہ استاد نے ترقی تنزل خلیفہ کے کسی معاملے میں کبھی دخل ہی نہیں دیا۲۔"

یہ آزاد کا محض افسانہ ہے کیونکہ بقول حافظ محمود شیرانی، آزاد نے یہ غزل خود کہہ کر

۱- آبِ حیات، ص ۶۱۳

۲- دیوانِ ذوق، ص ۱۳۷

www.paknovels.com

اپنے استاد سے منسوب کر دی ہے[1]۔

حالی کیوں آزاد سے پیچھے رہتے۔ یادگارِ غالب لکھتے ہوئے اپنے استاد کی عظمت میں اضافہ کرنے کے لیے انھوں نے بھی ایسی ہی ایک داستان بیان کر دی۔ لکھتے ہیں:

"ناظر حسین مرزا مرحوم کہتے تھے کہ ایک روز میں اور مرزا صاحب دیوانِ عام میں بیٹھے تھے کہ چوب دار آیا اور کہا کہ حضور نے غزلیں مانگی ہیں۔ مرزا نے کہا ذرا ٹھہر جاؤ اور اپنے آدمی سے کہا کہ پالکی میں کچھ کاغذ رومال میں بندھے ہوئے رکھے ہیں وہ لے آؤ۔ وہ فوراً لے آیا۔ مرزا نے اسے کھولا تو اس میں آٹھ نو پرچے، جن پر ایک ایک دو دو مصرعے لکھے ہوئے تھے، نکالے اور اسی وقت دوات قلم منگوا کر اُن مصرعوں پر غزلیں لکھنی شروع کیں اور وہیں بیٹھے بیٹھے آٹھ یا نو غزلیں تمام و کمال لکھ کر چوب دار کے حوالے کیں[2]۔"

آزاد اور پھر حالی کے بیانات نے ادبی دنیا میں اچھی خاصی غلط فہمی پیدا کر دی نواب نصیر حسین خیال، شان الحق حقی، خلیل الرحمٰن اعظمی، خواجہ تہور حسین، عمر فیضی[3] اور بعض

۱۔ تماہی ہندوستانی، ۱۹۴۷ء، بحوالہ ذکرِ غالب، ص ۱۱۶

۲۔ حالی کے اس بیان کے بارے میں قاضی عبدالودود لکھتے ہیں "..... حالی نے حسین مرزا کی زبانی (یہ درج نہیں کہ روایت خود ان سے معلوم ہوئی تھی یا کسی اور شخص سے) بہادر شاہ کی غزلوں پر اصلاح کا جو حال بیان کیا ہے، اس کے ماننے میں مجھے تامل ہے۔ بادشاہ کا کلام دیوانِ عام میں اس طرح دیکھا جائے کہ حاضرین پر یہ ظاہر ہو جائے کہ بادشاہ کی ۸، ۹ غزلوں میں سے کسی میں ایک دو مصرعے سے زیادہ نہ تھا، خلاف قیاس ہے" (بین الاقوامی غالب سیمینار)

۳۔ اس موضوع پر تفصیلی بحث کے لیے ملاحظہ ہوں۔ نوائے ظفر، مرتبہ خلیل الرحمٰن اعظمی، انجمن ترقی اُردو ہند، علی گڑھ، ۱۹۵۸ء ص ص ۵-۱۴۰ — بہادر شاہ ظفر، خواجہ تہور حسین، مکتبۂ نعیمیہ، ۱۹۶۷، دہلی، ص ص ۱۰۳-۱۲۰ — مغل اور اُردو، نواب نصیر حسین خیال، کلکتہ، ص ۱۵۷۔

www.paknovels.com

بعض دوسرے نقادوں نے مدلل طریقے سے یہ ثابت کیا ہے کہ ظفر خود شاعر تھے۔ نیاز فتحپوری، فراق گورکھپوری نے ذوق اور ظفر کے کلام کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے ثابت کیا ہے کہ ان دونوں کا رنگِ سخن ایک دوسرے سے مختلف ہے[1]۔ ہمارے عہد میں ڈاکٹر تنویر احمد علوی نے مدلل طریقے سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ظفر کا تمام کلام ذوق کا کہا ہوا ہے[2]۔ ان کے دلائل کا جواب دیتے ہوئے ڈاکٹر اسلم پرویز نے بہت صحیح لکھا ہے:

"ہماری مراد یہ بھی نہیں ہے کہ کلیاتِ ظفر کا ایک ایک مصرع ظفر کا کہا ہوا ہے۔ ممکن ہے ذوق نے بہت زیادہ اصلاح دی ہو۔ بعض استاد اپنے شاگردوں کے مصرع کے مصرع بدل دیتے ہیں۔ اور اگر شعر معمولی درجہ کا ہو تو شعر کاٹ کر اس قافیے میں دوسرا شعر کہہ دیتے ہیں ممکن ہے ذوق نے اکثر ایسا کیا ہو لیکن ظفر کا وہ حصہ جو قابلِ اعتنا ہے یقیناً ظفر کا کہا ہوا ہے[3]۔"

تقریباً یہی تمام دلائل ظفر اور غالب کے بارے میں دیے جا سکتے ہیں۔ اگر بقول حالی، غالب، پوری پوری غزلیں کہہ کر دیا کرتے تھے تو غالب اپنے خطوں میں اس کا ذکر ضرور کرتے۔ انھوں نے منشی نبی بخش حقیر کے نام خطوط میں قلعہ میں اپنی مختلف مصروفیات کا اکثر ذکر کیا ہے۔ وہ یہ بھی لکھ سکتے تھے کہ مجھے بادشاہ کو غزلیں کہہ کر دینی پڑتی ہیں۔ کہا جا سکتا ہے کہ اس وقت بادشاہ کی زندگی میں خطوں میں یہ بات لکھنی خلافِ مصلحت تھی۔ لیکن ۱۸۵۷ء کے بعد جب مغل حکومت بالکل ختم ہو گئی تھی تب تو غالب اس کا ذکر

۱۔ ملاحظہ ہو: انتقادیات، نیاز فتحپوری، کراچی، ص ص ۱۵۰-۱۵۲۔ اور انداز ے، فراق گورکھپوری، ص ص ۱۰۱-۱۰۲

۲۔ ذوق۔ سوانح و انتقاد، ص ص ۹۸-۱۰۰

۳۔ بہادر شاہ ظفر، ص ۳۶۴

www.paknovels.com

کرسکتے تھے۔ اس سے بڑی اور اہم دلیل یہ ہے کہ غالب کا انداز بیان اپنے عہد کے تمام سخنوروں سے بالکل مختلف تھا۔ غالب خواہ کتنا ہی دوسرے رنگ میں شعر کہنے کی کوشش کرتے۔ ان کے اپنے انداز بیان کا عکس ان اشعار پر ضرور ہوتا۔ کلیات ظفر میں ایک غزل بھی ایسی نہیں ہے جس پر غالب کی چھاپ لگی نظر آتی ہو۔ جو اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ رشتہ تلمذ حک و اصلاح سے زیادہ نہیں تھا۔

غالب اور ۱۸۵۷ء

۱۸۵۷ء کے ہنگامے سے کچھ پہلے غالب کی مالی حالت کافی اطمینان بخش ہوگئی تھی۔ انھیں انگریزی سرکار سے ساڑھے سات سو روپے سالانہ پنشن کے ایک زمانے سے مل ہی رہے تھے۔ بہادر شاہ ظفر نے بھی تاریخ نویسی کے لیے چھ سو روپے سالانہ مقرر کر رکھا تھا۔ مرزا فخرو چار سو روپے سالانہ بطور وظیفہ اور دس روپے ماہانہ باقر علی خاں اور حسین علی خاں کے پھلوں کے لیے دیتے تھے۔ اس طرح غالب کو ایک سو پچین روپے کچھ آنے ماہوار ملتے تھے۔ ۱۰ جولائی ۱۸۵۶ء کو مرزا فخرو کا انتقال ہو گیا۔ جس سے ۵۲۰ روپے سالانہ کی آمدنی بند ہوگئی۔ لیکن لگ بھگ چھ سات مہینے بعد ۵ فروری ۱۸۵۷ء کو نواب یوسف علی خاں ناظم ان کے شاگرد ہوگئے[1]۔ انھوں نے پہلے ہی خط کے ساتھ ڈھائی سو (۲۵۰) روپے بھیجے جس سے مرزا فخرو والے نقصان کی تلافی ہوگئی۔ لیکن تین مہینے بعد ۱۸۵۷ء کا انقلاب ہو گیا جس کی وجہ سے ان کی آمدنی کے تمام ذرائع یک لخت بند ہو گئے۔

انگریزوں نے مرزا فخرو کا اس شرط پر ولی عہد ہونا منظور کیا تھا کہ بادشاہ ہونے پر وہ قلعہ معلیٰ کی سکونت چھوڑ کر قطب صاحب چلے جائیں گے[2]۔ غالب اس شرط کا مطلب خوب

۱۔ مکاتیب غالب، ص ۷۹

۲۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، بہادر شاہ ظفر از اسلم پرویز (تحقیقی مقالہ دلی یونیورسٹی لائبریری)، ص ۱۰۵

www.paknovels.com

سمجھتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ اسی کے ساتھ مغل حکومت بھی ختم ہو جائے گی۔ اسی لیے وہ کوشش کرنے لگے کہ براہِ راست ملکۂ معظمہ سے تعلقات قائم کریں۔ اس سلسلے میں انھوں نے ۹ نومبر ۱۸۵۵ء کو ایک قصیدہ لارڈ الن برا کو بھیجا کہ اسے ملکۂ معظمہ کی خدمت میں پیش کر دیا جائے۔[۱] قصیدے کے ساتھ یہ درخواست بھی کی گئی تھی کہ انھیں ملکۂ معظمہ کی طرف سے خطاب عطا ہو، اور ان کے موجودہ خلعت اور پنشن میں اضافہ کیا جائے اس سلسلے میں ولایت سے کچھ خط و کتابت ہو ہی رہی تھی، بلکہ انھیں کچھ امید بھی بندھ چلی تھی کہ ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کو انقلابی دہلی میں داخل ہو گئے اور تمام نظام درہم برہم ہو گیا چار مہینے چار دن یعنی ۱۱ مئی سے ۱۴ ستمبر تک دلّی پر ہندستانیوں کا مکمل قبضہ رہا۔ یوں تو ہر ہندستانی کے لیے یہ بڑی سخت آزمائش کا وقت تھا لیکن جن لوگوں کے تعلقات انگریزوں سے اچھے رہے تھے، ان کی جان و مال دونوں کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ ان میں سے بیشتر کو واقعی انگریزوں سے ہمدردی تھی۔ ان میں دو طرح کے لوگ تھے۔ ایک وہ، جو انگریزوں سے اپنی ہمدردی کا اظہار عملی طور پر کر رہے تھے۔ یعنی انگریزوں کے ہندستانی جاسوسوں کی مدد کر رہے تھے۔ مثلاً شاہ بیگم نواب زینت محل، حکیم احسن اللہ خاں وغیرہ۔ دوسرے گروہ میں وہ لوگ تھے جنھیں انگریزوں سے ہمدردی تو تھی، لیکن وہ حالات سے مجبور اور خاموش تھے۔ مثلاً غالب، سرسید وغیرہ۔ اس وقت انگریزوں سے ہمدردی کا اظہار موت کے مترادف تھا۔ اس لیے یہ سب انقلابیوں سے خائف بظاہر ان ہی کی حمایت کر رہے تھے۔ اگر بہادر شاہ ظفر عین وقت پر مداخلت نہ کرتے، تو حکیم احسن اللہ خاں کو جان سے ہاتھ دھونا پڑتا۔

۱۔ ۷۹ اشعار کا یہ قصیدہ کلیاتِ فارسی میں موجود ہے۔ اس کا مطلع ہے:

نطقم نخست زمزمۂ خونچکاں دہد
کز خوں طراز سرورقِ داستاں دہد

۲۔ غالب نے غلام غوث خاں بیخبر کو لکھا ہے:

(باقی ص ۸۱ پر)

www.paknovels.com

انقلابیوں نے البتہ ان کی عالی شان حویلی جلا کر خاک کا ڈھیر کر دی۔ ان حالات میں دوسروں کی طرح غالب کے لیے بھی دربار میں حاضر ہونا ناگزیر تھا۔

۱۴ مئی ۱۸۵۷ء کے حالات کے تحت عبداللطیف نے ظفر کے دربار میں حاضر ہونے والے جن لوگوں کا ذکر کیا ہے[۱]۔ ان میں غالب کا نام بھی شامل ہے۔

۱۹ مئی ۱۸۵۷ء کے تحت جیون لال نے کئی شاعروں کا ذکر کیا ہے۔ جنھوں نے بادشاہ کی خدمت میں سکے پیش کیے تھے۔ ان میں غالب کا ذکر ہے[۲]۔

۲۶ مئی ۱۸۵۷ء کو عید کے موقع پر غالب نے ظفر کی خدمت میں قصیدۂ تہنیت پیش کیا تھا[۳]۔

۱۳ جولائی ۱۸۵۷ء کو بقول منشی جیون لال نیز اخبار عالمتاب، آگرہ، غالب نے آگرے کی فتح کی خوشی کے موقع پر ایک قصیدۂ تہنیت پیش کیا[۴]۔

(صفحہ ۸۰ سے آگے) ۱۷ دسمبر ۱۸۵۶ء کو لکھا ہوا حکم وزیر اعظم کا ولایت کی ڈاک میں مجھ کو آیا ہے کہ قصیدہ کے صلے اور جائزے کے واسطے کہ جو بتوسط لارڈ ڈالن برا، سائل نے بھجوایا ہے، خطاب اور خلعت اور پنشن کی تجویز ضرور ہے۔ جو حکم صادر ہوگا، سائل کو بتوسطِ گورنمنٹ اس کی اطلاع دینی منظور ہے۔ یہ حکم مورخہ ۱۷ دسمبر ۱۸۵۶ء آخر جنوری ۱۸۵۷ء میں میں نے پایا۔ فروری، مارچ، اپریل خوشی اور توقع میں گزرے؛ مئی ۱۸۵۷ء میں فلک نے یہ فتنہ اٹھایا۔" (خطوطِ غالب ۵، (بار سوم)، ص ۳۳۴)

۱۔ ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ، ص ۱۲۳

۲۔ معارف (مئی ۱۹۵۹ء)، ص ۳۹۲

۳۔ مولانا ابوالکلام آزاد لکھتے ہیں: میں نے ایک مرتبہ طالب مرحوم سے اس بارے میں گفتگو کی تھی۔ وہ کہتے تھے، یہ بات میرے سننے میں بھی آئی ہے کہ غدر کے بعد جب عید آئی، تو مرزا غالب نے حسبِ معمول تہنیت کا قصیدہ لکھا اور پیش کیا۔ (معارف، مئی ۱۹۵۹ء، ص ۳۹۳)

۴۔ صحیفہ، غالب نمبر ۱۹۶۹ء، ص ۲۷۱

www.paknovels.com

۱۹ جولائی ۱۸۵۷ء کے تحت ایک انگریزی جاسوس گوری شنکر نے لکھا ہے کہ کل اسد اللہ خاں غالب نے سکۂ زر ایک پرچے پر لکھا؛ اور پھر یہ سکہ درج کیا ہے:

بزر زد سکۂ کشورستانی
سراج الدین بہادر شاہ ثانی ۱

۱۱ اگست ۱۸۵۷ء کے تحت عبد اللطیف لکھتے ہیں:

"نجم الدولہ نواب اسد اللہ خاں غالب نے ایک قصیدہ لکھ کر بادشاہ کو سنایا اور خلعت زیب تن کیا۔ غالب فارسی زبان پر پورا عبور رکھتے ہیں۔ ان کی بہت سی تصنیفات ہیں۔ ہندوستان میں پیدا ہوئے لیکن اہلِ فارس پر سبقت لے گئے"۔ ۲

ان تمام واقعات سے یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ غالب اس دوران میں کئی بار دربار میں حاضر ہوئے۔ ظاہر ہے اوپر دی گئی تاریخوں کے علاوہ بھی وہ قلعے گئے ہوں گے۔ ان دنوں میں عام ہندوستانیوں کا خیال تھا کہ فتح ہندستانیوں کی ہوگی۔ اس لیے بھی غالب نے دربار سے تعلقات قائم رکھے۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ غالب کم سے کم اگست کے آخر تک قلعے ضرور جاتے رہے اور جب حالات بگڑنے لگے تو انھوں نے آمد و رفت بند کر دی۔ خاموش رہے اور پھر انھوں نے انگریزوں کی خوشامد شروع کر دی غالب نے نظم و نثر دونوں میں متعدد بار یہ دعوی کیا ہے کہ انقلابیوں سے ان کا کوئی تعلق نہیں رہا؛ ۱۱ رمئی ۱۸۵۷ء کو وہ گھر کا دروازہ بند کر کے خانہ نشین ہو گئے تھے۔ انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ اگر میں نے انگریزوں کی کوئی مدد نہیں کی تو اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ ضعیفی کی وجہ سے میں مجبور اور لاچار تھا۔ غالب نے ایڈمنسٹن بہادر لفٹنٹ گورنر صوبۂ شمالی و مغربی کو مخاطب کر کے ایک فارسی قصیدہ لکھا، جس میں یہ اشعار بھی ہیں:

۱۔ معارف (فروری ۱۹۵۸ء)

۲۔ ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ، ص ۱۵۸

www.paknovels.com

در وقتِ فتنہ بودم غمگین و بود بامن
زاری و بینوائی، پیری و ناتوانی
حاشاکہ بودہ باشم، باغی باشکارا
حاشاکہ کردہ باشم ترکِ وفا نہانی
از تہمتے کہ برمن بستند بدسگالاں
حکام راست بامن یک گونہ سرگرانی

غالب نہ صرف انگریزی حکام کے سامنے اپنی صفائی پیش کرتے ہیں، بلکہ انھوں نے بعض دوستوں کو بھی ایسی باتیں لکھیں، جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ مثلاً چودھری عبدالغفور سرور کو لکھتے ہیں:

"۱۱رمئی، ۱۸۵۷ء کو یہاں فساد شروع ہوا۔ میں نے اسی دن گھر کا دروازہ بند اور آنا جانا موقوف کر دیا۔"[1]

غالب کو خوب معلوم تھا کہ انگریز ان سے خوش نہیں؛ لیکن انھیں صرف اتنا خیال تھا کہ انقلاب کے دوران قلعے میں اُن کی آمد و رفت انگریزوں کو ناگوار گزری ہے۔ اس لیے انھوں نے اپنے عزیز شاگرد نواب یوسف علی خاں ناظم والیِ رامپور کے ذریعے سے انگریزوں سے اپنی صفائی چاہی۔ ۱۴رجنوری ۱۸۵۸ء کے خط میں نواب رامپور کو لکھتے ہیں:

".... پیوندِ تعلق با بہادر شاہ جز آن نبود کہ از ہفت ہشت سال بتحریرِ تاریخِ سلاطینِ تیموریہ و از دو سہ سال بہ اصلاحِ اشعارِ شہریار می پرداختم۔ درین ہنگامہ خود را بکنار کشیدم، و بدین اندیشہ کہ مباد، اگر یک قلم ترکِ آمیزش کنم، خانۂ من بتاراج رود و جان در معرضِ تلف افتد، بباطن بیگانہ و بظاہر آشنا ماندم۔"[2]

۱۔ خطوطِ غالب، ص ۴۶۹

۲۔ ایضاً، ص ۹

www.paknovels.com

غالب نے یہ تمام واقعات نواب یوسف علی خاں ناظم کو اس لیے لکھے کہ نواب صاحب نے انقلاب میں انگریزوں کا ساتھ دیا تھا؛ اور انگریزوں سے اُن کے تعلقات بہت اچھے تھے۔ انھیں یقین تھا کہ اگر نواب صاحب ان کی صفائی پیش کریں گے، تو یہ مشکل دُور ہو جائے گی۔ غالب اپنی صفائی پیش کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کرتے رہے۔ اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی دستنبو بھی تھی۔

دستنبو

غالب کو یہ یقین تھا کہ ان سب حالات کے باوجود حکومت انھیں بے گناہ سمجھتی ہے۔ اس لیے وقت آنے پر انھیں اپنا حق مل جائے گا۔ اسی لیے جب انھوں نے سُنا کہ سر جان لارنس دلّی کے چیف کمشنر ہو کر آ رہے ہیں تو ایک قصیدہ جو مشتمل تھا تہنیتِ فتح اور خیر مقدم نوروز پر، ۱۹ر فروری ۱۸۵۸ء کو بذریعہ ڈاک ان کی خدمت میں بھیجا۔[۱] قوی امکان ہے کہ غالب کو اس قصیدے کا کوئی جواب نہ ملا ہو۔ کیونکہ جواب ملنے کی صورت میں ممکن نہیں تھا کہ غالب دستنبو میں اس کا بڑے فخر کے ساتھ ذکر نہ کرتے۔[۲] ۲۷ فروری ۱۸۵۸ء کو انگریزی حکومت نے بقولِ غالب "داد پژوهانِ رنجور" کو حاضر ہونے کی اجازت دے دی اور پریشاں حال لوگوں کو اپنی پناہ میں لے لیا۔ اس بیان سے غالب کی مراد غالباً یہ ہے کہ انگریزی حکومت نے اعلان کر دیا کہ وفادارانِ حکومت اپنی جایداد اور املاک وغیرہ کے سلسلے میں درخواستیں دیں۔ موقع ملتے ہی انھوں نے

۱۔ دستنبو، ص ۳۲

۲۔ اس قصیدے کا جواب آنا تو در کنار، غالب نے انقلاب سے پہلے ملکۂ معظمہ کو جو قصیدہ بھیجا تھا وہ بھی آ گیا۔ غالب نے غلام غوث خاں بیخبر کو لکھا ہے: "لارڈ کیننگ صاحب نے بعد فتح دہلی میرا قصیدہ مجھ کو واپس بھیجدیا۔ صاحب سکرٹر نے مجھ سے کہہ دیا کہ تم ایام غدر میں بادشاہِ باغی کے مصاحب رہے۔ اب گورنمنٹ کو تم سے راہ و رسم آمیزش منظور نہیں۔" (خطوط غالب، ص ۳۳۰)

www.paknovels.com

اوائل مارچ میں چیف کمشنر کو براہِ راست خط لکھا، جس میں ستایش اور تہنیت کے بعد اصل مدعا بیان کیا![1]

بقولِ غالب، ۱۱رمارچ کو انھیں یہ اطلاع دی گئی کہ "ایں نامہ کہ جز ستایش و چشمِ روشنی ہیچ ندارد، ہیچگونہ ناگزیر نیست[2]"۔ اور پنشن کے سلسلے میں معلومات فراہم کرنے کے لیے یہ خط کلکٹر کو بھیج دیا گیا۔ کلکٹر نے اس پر کیا لکھا، اس کا غالب کو قطعی علم نہیں تھا۔ البتہ حکومت کی اس کارروائی سے غالب کو یہ یقین ضرور ہوگیا کہ ان پر کوئی سنگین الزام نہیں ہے۔ وہ ۱۲رمارچ ۱۸۵۸ء کو مرزا ہرگوپال تفتہ کے نام ایک خط میں اوپر والی درخواست کا ذکر کرکے لکھتے ہیں[3]:

"بہر حال یہ خدا کا شکر ہے کہ بادشاہی دفتر سے میرا کچھ شمول فساد میں پایا نہیں گیا اور میں حکام کے نزدیک یہاں تک پاک ہوں کہ پنشن کی کیفیت طلب ہوئی ہے اور میری کیفیت کا ذکر نہیں ہے۔ یعنی سب جانتے ہیں کہ اس کو لگاؤ نہ تھا۔"

لیکن معلوم ہوتا ہے کہ پنشن کی بات یہیں رک گئی۔ غالب نے یاد دہانی کرائی، تو کوئی جواب نہیں ملا[4]۔ غالب حکام سے ملنے کی درخواست کریں، تو کوئی ملنے کو تیار نہیں؛ خط لکھیں تو کوئی جواب نہیں دیتا۔ اس مشکل کا حل غالب نے یہ نکالا کہ دستنبو کے نام سے ایک معذرت لکھنا شروع کی۔ غالب کا دعویٰ ہے کہ یہ ان کا روزنامچہ ہے۔ وہ عبدالغفور سرور کو لکھتے ہیں:

۱۔ دستنبو، ص ۳۵

۲۔ ایضاً، ص ۳۵

۳۔ خطوطِ غالب، ص ص ۱۴۸ - ۱۴۹

۴۔ غالب نے اکتوبر ۱۸۵۸ء کے ایک خط میں میر مہدی مجروح کو لکھا ہے: "پنشن کا حال کچھ معلوم ہوا ہو تو لکھوں۔ حاکم خط کا جواب نہیں لکھتا۔" (خطوطِ غالب، ص ۲۷۰)

www.paknovels.com

"۱۱ رمئی ۱۸۵۷ء کو یہاں فساد شروع ہوا۔ میں نے اسی دن گھر کا دروازہ بند اور آنا جانا موقوف کر دیا۔ بے شغل زندگی بسر نہیں ہوتی۔ اپنی سرگذشت لکھنا شروع کی جو سنا گیا وہ بھی ضمیمۂ سرگذشت کرتا گیا۔"[1]

یہاں غالب نے دو باتیں کہی ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ ۱۱ مئی کو دروازہ بند کر کے گھر پر بیٹھ گئے تھے اور دوسرے دستنبو اُن کا روزنامچہ ہے، جو وہ گویا اوّل دن سے لکھ رہے تھے۔ ان دونوں باتوں کا حقیقت سے دُور کا بھی واسطہ نہیں۔ غالب کے پہلے بیان کی تردید کی جا چکی ہے، بلکہ خود غالب نے نواب یوسف علی خاں ناظم کے خط میں یہ اعتراف کیا۔ دوسرا بیان، تو ان کے خطوط میں دستنبو کی تصنیف کا ذکر پہلی بار ۱۸ جولائی ۱۸۵۸ء کے ایک خط میں ملتا ہے، جس میں انھوں نے لکھا ہے:

"میں نے بعد توطیہ و تمہید آغازِ مئی ۱۸۵۷ء سے اپنی سرگذشت لکھی ہے۔"[2]

انقلاب کے بعد غالب کا پہلا خط ۵ دسمبر ۱۸۵۷ء کا لکھا ہوا ملتا ہے۔ اس تاریخ سے ۱۸ جولائی ۱۸۵۸ء تک نواب علاء الدین احمد خاں علائی، شہاب الدین احمد خاں ثاقب، نواب یوسف علی خاں ناظم، مرزا ہرگوپال تفتہ، مرزا حاتم علی بیگ مہر، اور میر مہدی مجروح کے نام غالب کے کم سے کم بیس خط ملتے ہیں۔ لیکن ان میں سے کسی میں بھی دستنبو کی تصنیف کا ذکر نہیں ہے۔ چونکہ دستنبو میں مرزا ہرگوپال تفتہ کا ذکر بطورِ خاص تھا اس لیے بھی غالب اس تصنیف کے سلسلے میں انھیں ضرور لکھتے۔ ۱۸ جولائی ۱۸۵۸ء کے بعد ۸ اگست ۱۸۵۸ء کے خط میں غالب دستنبو کے بارے میں میر مہدی مجروح کو لکھتے ہیں:

"تم کو آگے اس سے لکھا تھا کہ تم اپنے اوراق کا فقرۂ اخیر لکھ بھیجو؛ اب پھر تم کو لکھا جاتا ہے کہ جلد لکھو، تاکہ میں اس کے آگے کی عبارت تم کو لکھ کر

۱۔ خطوطِ غالب، ص ۴۶۹

۲۔ غالب کی نادر تحریریں، ص ۴۴

www.paknovels.com

بھیج دوں[1]۔"

اس خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالب نے جو کچھ لکھا تھا، اس کی نقل مجروح کو بھیجی تھی اور باقی بھیجنا چاہتے تھے۔ خطوطِ غالب میں ۸ اگست ۱۸۵۸ء سے قبل اپریل اور مئی ۱۸۵۷ء کے خطوط شامل ہیں۔ لیکن ان میں دستنبو کا کوئی ذکر نہیں۔ غالباً مئی اور اگست کے درمیان غالب نے مجروح کو جو خط لکھے تھے، وہ ضائع ہو گئے اور یہی وہ زمانہ ہے (یعنی مئی اور ۸ اگست کی درمیانی مدت) جب دستنبو تصنیف ہوئی۔

ضمناً یہاں ایک اور بات کی طرف بھی اشارہ ضروری ہے:

غالب نے ۷ فروری ۱۸۵۸ء کے ایک خط میں مجروح کو لکھا ہے "نثر کیا لکھوں اور نظم کیا کہوں گا، وہی دو چار ورق اور بھی سیاہ کیے ہیں[2]۔" اس عبارت کے بارے میں مولانا غلام رسول مہر نے حاشیہ میں لکھا ہے کہ "یہ غالباً دستنبو کی طرف اشارہ ہے۔" میرا ذاتی خیال ہے کہ یہ کوئی اور تحریر ہوگی، دستنبو نہیں ہے۔ اس سلسلے میں میرے دلائل یہ ہیں۔ مجروح کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ انقلاب کے آغاز میں پانی پت چلے گئے تھے۔ چونکہ اس کی مجھے قطعی شہادت نہیں ملی، اس لیے میں فرض کر لیتا ہوں کہ وہ دورانِ انقلاب میں بھی یہیں رہے۔ لیکن ۱۴ ستمبر کے قریب جب کہ دِلّی پر انگریزوں کو فتح ہوئی، وہ یقیناً دلّی سے چلے گئے تھے۔ ۱۴ ستمبر سے کچھ پہلے تک، جیسا کہ میں ثابت کر چکا ہوں کہ غالب قلعے کے وفادار تھے۔ انھوں نے ۱۱ اگست ۱۸۵۷ء کو ظفر کی مدح میں قصیدہ پڑھا تھا۔ یہ ممکن نہیں کہ ایک طرف تو وہ قلعے میں ظفر کی مدح کریں، اور گھر آ کر روزنامچے میں ان کے خلاف زہر اگلیں۔ اس کے علاوہ جن لوگوں کا انگریزوں سے کسی طرح کا بھی واسطہ رہا تھا، وہ ہندوستانیوں کی نظر میں مشتبہ تھے۔ دلّی میں یہ منظر عام تھا کہ جس پر انگریز سے وفاداری کا شبہہ ہوا، وہ قتل کر دیا گیا، اور اس کے گھر بار

۱۔ خطوطِ غالب، ص ۲۶۹

۲۔ ایضاً ، ص ۲۶۶

www.paknovels.com

کو لوٹ کر آگ لگا دی۔ غالب انگریزوں کے پنشن دار تھے اور حکیم احسن اللہ خاں (جنھیں انگریزوں کا طرفدار سمجھا جاتا تھا) اُن کے مربّی تھے۔ اس لیے غالب جیسے سمجھدار آدمی سے یہ اُمید نہیں کی جا سکتی کہ وہ اپنے گھر میں کوئی ایسی تحریر رکھے گا، جس سے انگریزوں سے وفاداری ثابت ہو سکے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ۱۴ر ستمبر (فتحِ دہلی) سے پہلے غالب دستنبو نہیں لکھ سکتے تھے اور اس تاریخ کے بعد مجروح دلّی میں نہیں رہ سکتے تھے۔ غالب نے جس تحریر کا ذکر کیا ہے، وہ یقیناً کوئی اور چیز ہے۔ ممکن ہے کہ قاطع برہان ہو۔ غالب کا یہ دعویٰ بھی مجھے درست نہیں معلوم ہوتا کہ برہانِ قاطع پر حاشیے انھوں نے دورانِ انقلاب میں لکھے تھے۔ غالب نے ۱۸ر جولائی ۱۸۵۸ء کے خط میں یہ بھی لکھا ہے:

"چالیس صفحے لکھ چکا ہوں۔ اتمام میں انتظار یہی ہے کہ پنشن کا مقدمہ طے ہو چکے، ملے یا جواب ملے؛ اور میں بہر حال کسی جگہ اقامت گزیں ہو لوں[۱]۔"

اس عبارت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ دستنبو نہ صرف معذرت نامہ تھی[۲]، بلکہ پنشن سے بھی متعلق تھی۔ غالب کو امید تھی کہ انھیں پنشن بہر حال مل جائے گی۔ وہ دستنبو کے ذریعے سے خلعت اور نمبر کی کوشش کرنا چاہتے تھے۔ اوائلِ اگست ۱۸۵۸ء تک پنشن کے سلسلے میں کوئی پیشرفت نہیں ہوئی۔ البتہ، اگست کو بات کچھ آگے بڑھی، جس کا ذکر غالب ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"پنشن کی صورت یہ ہے کہ کوتوال سے کیفیت طلب ہوئی۔ اس نے اچھی لکھی۔ کل ہفتے کے دن ساتویں اگست کی مجھ کو اجرٹن صاحب بہادر "ڈپٹی کمشنر" نے بلایا۔ کچھ سہل سوال مجھ سے کیے۔ اب ایسا معلوم ہوتا ہے

۱۔ غالب کی نادر تحریریں، ص ۴۲

۲۔ مجھ سے پہلے کئی محققینِ غالب اس حقیقت کی طرف اشارہ کر چکے ہیں۔ (خ۔ ا)

www.paknovels.com

کہ تنخواہ ملے[1]۔"

اس لیے غالب نے سوچا کہ دستنبو ختم کر کے اسے حصولِ مقاصد کے لیے استعمال کیا جائے۔ وہ اس واقعے کے دوسرے ہی دن یعنی ۸ اگست ۱۸۵۰ء کو میر مہدی مجروح کو لکھتے ہیں:

"صاحب! ہم نے گھبرا کر اس تحریر کو تمام کیا، دفتر بند کیا اور یہ لکھ دیا کہ یکم اگست ۱۸۵۸ء تک میں نے پندرہ مہینے کا لکھا اور آیندہ لکھنا موقوف کیا[2]۔"

۷/ اگست کو غالب نے دستنبو مکمل کی ہے اور اس کے اگلے ہی دن یعنی ۸ اگست کو اس کے شائع کرانے کی کوشش میں مصروف ہو گئے۔ ۸ اگست کو ایک خط میں دستنبو کی تفصیل بیان کر کے غالب نے تفتہ کو لکھا ہے:

"اگر آگرے میں اس کا چھاپا ہو سکے، مجھ کو اطلاع کرو۔ اس تہی دستی اور بینوائی میں پچیس کا میں بھی خریدار ہوں۔ لیکن صاحبِ مطبع اتنے پر کیوں مانے گا، اور البتہ چاہے اگر ہزار نہ ہوں، تو پانسو جلد تو چھاپی جائے[3]۔"

آخر غالب کی کوشش بار آور ہوئی اور دستنبو کے چھپنے کا انتظام ہو گیا۔ اس کی تفصیل غالب نے میر مہدی مجروح کو ان الفاظ میں لکھی ہے:

"منشی امید سنگھ اندور والے دلّی آئے تھے۔ سابقہ معرفت مجھ سے نہ تھا۔ ایک دوست ان کو میرے گھر لے آیا۔ انھوں نے وہ نسخہ دیکھا۔ چھپوانے کا قصد کیا۔ آگرے میں میرا شاگردِ رشید منشی ہرگوپال تفتہ تھا

۱۔ سہل سوال کی تفصیل غالب نے حکیم غلام نجف خاں کو ان الفاظ میں لکھی ہے:
"صرف اتنا ہی پوچھا کہ غدر میں تم کہاں تھے؟ جو مناسب ہوا، کہا گیا۔" (خطوطِ غالب، ص ۳۷۴)

۲۔ خطوطِ غالب، ص ۲۶۹

۳۔ ایضاً ص ۱۵۴

www.paknovels.com

اس کو میں نے لکھا۔ اس نے اس اہتمام کو اپنے ذمے لے لیا۔ مسودہ بھیجا گیا۔ آٹھ آنے فی جلد قیمت ٹھہری۔ پچاس جلدیں منشی اُمید سنگھ نے لیں، پچیس روپے چھاپے خانے میں بطور ہنڈوی بھجوا دیئے۔[۱]"

اگرچہ غالب نے متعدد مقامات پر یہ دعویٰ کیا ہے کہ دستنبو ان کا روزنامچہ ہے جسے وہ آغازِ انقلاب سے لکھ رہے تھے۔ مگر دستنبو میں بہت سی اندرونی شہادتیں موجود ہیں، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ روزنامچہ ہرگز نہیں۔ غالب نے اسے صرف چند دن میں لکھا ہے۔ دستنبو میں انگریزوں کی مدح و ستائش ان الفاظ میں کی گئی ہے:

ازخوانِ این جہانستانان نان یافتہ ام (ص ۵)
جہاندارانِ داد آموز، دانش اندوز، نکوخوے، نکونام (ص ۶-۷)
آزادان و نیک نہاداں (ص ۳۳)
شیر مردان (ص ۱۱)
ہزبرانِ خشمگیں (ص ۱۵)
کشورکشایان (ص ۱۷)

اس کے برعکس ہندستانی سپاہیوں کو برُا بھلا کہنے، بلکہ گالیاں تک دینے میں انھوں نے کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ مثلاً

سپاہِ کینہ خواہ (ص ۶)
بے آزرم و شر انگیز (ص ۶)
کور نمکان (ص ۷)
زشت سرشت (ص ۱۵)
آوارہ چند و بیتارہ چند (ص ۱۵)
روسیاہانِ گم کردہ (ص ۱۶)

۱۔ خطوط غالب، ۲۷۰

www.paknovels.com

گرازان (ص ۱۶)

بدان وبدگہران (ص ۳۳)

..کہ گردن (سپاہیانِ ہند) از فرماندہان (انگریز) بہ پیچید، سرش درخورگفش

است (ص ۳۵-۳۶)

اس سب کے علاوہ غالب نے انقلاب کی تاریخ "رستخیز بیجا" سے نکالی ہے. جیسا کہ میں لکھ چکا ہوں۔ دورانِ انقلاب میں انگریزوں کی یہ مدح اور ہندستانیوں کی اس طور پر مذمّت غالب جیسے محتاط آدمی سے ممکن نہیں تھی۔

دستنبو کی ابتدا خدا کی مدح سے ہوتی ہے۔ اس کے بعد غالب نے وفاداری اور بغاوت کا انتہائی مضحکہ خیز فلسفہ بیان کر کے ثابت کیا ہے کہ ہندستانی فوج نے اپنے آقاؤں اور سرداروں یعنی انگریزوں سے بغاوت کر کے انتہائی نادانی اور کمینہ پن کا ثبوت دیا ہے۔ دستنبو کی یہ تمہید صحیح معنوں میں ایک نثری قصیدہ ہے، جس میں انھوں نے انگریزوں کی عظمت، شان و شوکت اور انصاف پسندی کے گیت گائے ہیں۔ اس کے بعد قلعے سے اپنے تعلقات پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ اگرچہ میں بادشاہ کا ملازم تھا لیکن بوڑھا اور ضعیف ہونے کی وجہ سے تقریباً گوشہ گیر رہا۔ بہرا ہونے کی وجہ سے اہلِ محفل کے دلوں پر بوجھ بن جاتا۔ اگر محفل میں کوئی شخص کچھ کہتا تو میں اس کے ہونٹوں کو بغور دیکھتا رہتا تاکہ اس کی بات سمجھ سکوں۔ مجبوراً ہفتے میں ایک دو مرتبہ قلعے جاتا تھا۔[1] اگر بادشاہ محل سے تشریف لے آتے تو کچھ دیر حاضر رہ کر واپس آجاتا اور اس مدت میں جتنی تاریخ لکھی ہوتی، اسے اپنے ساتھ لے جاتا۔ یا کسی کے ہاتھ بھیج دیتا۔ اس طرح غالب نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ میرا قلعے کی بات

۱۔ حال آنکہ غالب نے خود قاضی عبدالجمیل جنوں کو ۲۰ر نومبر ۱۸۵۵ء کو لکھا تھا:

"صبح کو میں ہر روز قلعے جاتا ہوں..... میں اگر قلعے جاتا ہوں، تو پہر دن چڑھے آتا ہوں۔" (خطوطِ غالب، ص ۱۸۰)

www.paknovels.com

سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ ہفتے میں ایک دو دفعہ مجبوراً قلعے جاتا تھا۔ بہرا ہونے کی وجہ سے کسی کی بات بھی نہیں سُن سکتا تھا۔ یہاں تک غالب نے جو کچھ لکھا ہے، اس کا روزنامچے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ البتہ اس سے ان کا مقصد ضرور واضح ہوجاتا ہے۔

اس کے بعد غالب ۱۱ مئی، ۱۸۵۷ء کا ذکر کرتے ہیں کہ میرٹھ سے ہندستانی سپاہی دِلّی پہنچے اور انھوں نے انگریزوں کا قتل شروع کر دیا۔ یہاں غالب نے یہ بھی بتایا ہے کہ جو لوگ اس بغاوت کے خلاف تھے، وہ گھروں میں بیٹھے رہے اور انھیں میں غالب بھی تھے (ظاہر ہے کہ یہ غالب کی مصلحت ہے، ورنہ وہ قلعے میں برابر جاتے رہے تھے) پھر غالب نے انگریزوں کے بے رحمی سے قتل ہونے پر اظہارِ افسوس اور ہندستانی باغیوں کو یہ کہہ کر مذمت کی ہے کہ انھوں نے جنگ کے طریقے تو انگریزوں سے سیکھے، اسلحہ ان سے حاصل کیا، اور پھر اپنے استادوں اور مالکوں ہی کی جان کے درپے ہوگئے۔ اسی سلسلے میں غالب نے یہ بتانے کی بھی کوشش کی ہے کہ یہ تو گویا غنڈے اور ذلیل لوگ تھے، جنھوں نے انگریزوں کے خلاف ہتھیار اُٹھائے، ورنہ شرفا تو انگریز کے ساتھ تھے۔ حکیم احسن اللہ خاں کے مکان کو نذرِ آتش کیے جانے کا واقعہ بیان کر کے غالب نے نواب یوسف علی خاں کی انگریزوں سے وفاداری اور فرخ آباد کے تفضل حسین، بریلی کے خاں بہادر خاں اور لکھنو کے شرف الدولہ کی ظفر سے وفاداری کا ذکر کیا ہے۔

اس کے بعد ۱۸ ستمبر کا مختصر سا ذکر کیا ہے، جب انگریزی فوجیں دلّی میں داخل ہوئی تھیں؛ اور اس پر خوشی کا اظہار کیا ہے اور لکھا ہے کہ غصّے سے بپھرے ہوئے شیروں (انگریز) نے بے سروسامان کو قتل کرنا اور ان کے گھر بار جلانا شروع کر دیے۔ غالب انگریزوں کے ظلم واستبداد کو یہ کہہ کر جائز قرار دیتے ہیں کہ لڑائی کے بعد فاتح ایسا ہی کرتے ہیں۔ پھر غالب نے اپنے حالات اور مشکلات بیان کر کے اپنے مختصر سوانح بیان کیے ہیں۔ جس میں مرزا یوسف کا ذکر بھی شامل ہے، اس کے بعد وہ انگریزی فوجوں کے بارے میں

www.paknovels.com

بتاتے ہیں کہ انھیں حکم ہے کہ جو شخص مطیع ہو جائے، اس کا صرف مال چھین لیا جائے؛ اور جو مطیع نہ ہو، مال کے ساتھ اس کی جان بھی لے لی جائے۔ بہت کم ایسا ہوا ہے کہ بے گناہوں کو قتل کیا گیا ہو، اور بوڑھوں، عورتوں اور بچّوں کو ہاتھ نہیں لگایا گیا[1]۔ پھر مرزا یوسف کی وفات کی خبر دے کر حاکمانِ جھجھر، فرخ نگر، بہادر گڑھ اور بلب گڑھ کی گرفتاری اور ان کے قتل کی اطلاع دی ہے۔ یہاں تک دستنبو میں جو کچھ کہا گیا ہے، اسے اختصار کے ساتھ یوں کہا جا سکتا ہے:

۱۔ ۱۱ مئی کے واقعات سے متاثر ہو کر غالب گوشہ نشین ہو گئے۔

۲۔ بیگناہ انگریز مردوں، عورتوں اور بچّوں کا قتل ہوا۔

۳۔ جن ہندستانی سپاہیوں نے انگریزوں سے فوجی تربیت پائی تھی اور فوجی ساز و سامان حاصل کیا تھا، وہی اپنے آقاؤں اور استادوں کے خلاف صف آرا ہو گئے۔

۴۔ شرفا تباہ و برباد ہوئے۔ ذلیلوں اور کم رتبہ لوگوں (ہندستانی سپاہیوں) کی بن آئی۔

۵۔ انگریزی انتظام کا تباہ ہونا، خدا کی ودیعت کی ہوئی نعمت کا درہم برہم ہونا تھا۔

۶۔ بادشاہ اس قابل نہیں تھا کہ باغیوں کو نکال سکے۔

۷۔ باغیوں نے حکیم احسن اللہ خاں کا مکان لوٹ کر آگ لگا دی۔

۸۔ ہندستانی فوج میں تقریباً پچاس ہزار سپاہی تھے۔

۹۔ فرخ آباد کے سردار تفضل حسین خاں نے بہادر شاہ ظفر کے نام ایک خط میں خود کو نیاز مندِ قدیم لکھا۔

۱۰۔ بریلی کے خان بہادر خان نے ایک سو ایک اشرفیاں، نقرئی ساز و سامان، آراستہ ہاتھی اور گھوڑا بارگاہِ شاہی میں تحفۃً بھیجا۔

۱۔ ظاہر ہے کہ غالب کا یہ بیان صریحاً خلافِ حقیقت ہے۔

www.paknovels.com

۱۱- رامپور کے نواب یوسف علی خاں نے جو انگریزوں کے وفادار ہیں، ہندستانی سپاہیوں کو پیغام بھیجا کہ اپنے ارادے سے باز آئیں۔

۱۲- لکھنؤ میں بغاوت ہوگئی (۵ جولائی، ۱۸۵۷ء) شرف الدولہ نے واجد علی شاہ کے لڑکے کو تخت پر بٹھا دیا۔

چار مہینے کا یہ عرصہ تاریخی اعتبار سے اہم ترین زمانہ ہے۔ غالب اس دوران میں قلعے جا رہے تھے۔ ممکن نہیں کہ انھیں اگر تمام نہیں تو بیشتر حالات کا علم نہ ہوا ہو۔ لیکن چونکہ یہ دور انگریزوں کی شکست اور رسوائی کا دور تھا۔ اس لیے غالب صرف چند غیر اہم سے واقعات اس زمانے کے بیان کرتے ہیں۔ غالب نے یہ واقعات بہت عرصے بعد قلمبند کیے ہیں۔ اس لیے تاریخیں دینے سے معذور ہیں۔ مثلاً غالب بتا سکتے تھے کہ حکیم احسن اللہ خاں کا مکان کس دن جلا۔ فرخ آباد کے نواب تفضل حسین خاں نے کونسی تاریخ بہادر شاہ ظفر کو خط لکھ کر ان سے اپنی نیازمندی کا اظہار کیا۔ بریلی کے سردار خان بہادر خان نے کب اپنا تحفہ بہادر شاہ ظفر کی خدمت میں بھیجا۔ اسی طرح واجد علی شاہ کا بیٹا کب مسند نشین کیا گیا۔ چونکہ دستنبو روزنامچے کی طرح نہیں لکھی گئی بلکہ واقعات گزرنے کے بہت دن بعد چند روز میں لکھی گئی، اس لیے ان کے ہاں کئی واقعات کی ترتیب بھی غلط ہے۔ مثلاً غالب نے پہلے حکیم احسن اللہ خاں کے ساز و سامان لٹنے اور ان کے گھر میں آگ لگنے کا واقعہ لکھا ہے اور اس کے بعد خان بہادر خان کا ذکر کیا ہے اور پھر واجد علی شاہ کے بیٹے برجیس قدر کی مسند نشینی کا واقعہ قلمبند ہوا ہے۔ یہ ترتیب صریحاً غلط ہے۔ احسن اللہ خاں کا مکان ۱۸/اگست، ۱۸۵۷ء کو جلایا گیا[1]۔ خان بہادر خان نے اشرفیاں ۱۱/جولائی، ۱۸۵۷ء کو بھیجیں[2]۔ واجد علی شاہ کے بیٹے کو شرف الدولہ نے ۵/جولائی، ۱۸۵۷ء کو مسند نشین کیا[3]۔

۱- ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ، ص ۱۶۲

۲- 〃 〃 〃 ، ص ۱۴۷

۳- جنگِ آزادی، ۱۸۵۷ء، ص ۲۰۷

www.paknovels.com

اس کے بعد غالب نے ۱۴ر ستمبر کو دہلی میں انگریزوں کے دوبارہ داخل ہونے اور ۱۸ر ستمبر کو مکمل فتح پانے کا مختصر حال لکھ کر اپنی رُوداد بیان کی ہے۔ یعنی جب دہلی میں لوٹ مار ہو رہی تھی، تو کس طرح غالب اور ان کے اہلِ محلہ نے گلی کا دروازہ بند کر کے پتھر کی دیوار چُنی یا پھر کس طرح مہاراجہ پٹیالہ کے سپاہیوں نے ان کی رکھوالی کی! یا دلی میں پانی اور غلّے کا قحط کس طرح پڑا! غالب نے دستنبو کے شروع میں لکھا تھا کہ میں نے بچپن سے انگریزوں کے نان و نمک سے پرورش پائی ہے۔ یہاں اسی اجمال کی تفصیل بیان کی ہے۔ یعنی اپنے چچا نصر اللہ بیگ خاں کی انگریزی فوج میں ملازمت اور ان کا انتقال اور چچا کی جاگیر سے پنشن مقرر ہونے کا حال لکھا ہے۔ اس کے بعد اپنے بھائی میرزا یوسف کے کچھ حالات بیان کر کے، اُس قصیدے کی تفصیلات بیان کی ہیں جو غالب نے ملکہ وکٹوریہ کی مدح میں کہا تھا۔ اس ضمن میں غالب کے تین مطالبات کا بھی ذکر آ گیا ہے۔ پہلا مطالبہ یہ تھا کہ ملکہ معظمہ غالب کو خطاب دیں؛ دوسرے، خلعت دیں؛ تیسرے، پنشن میں اضافہ کریں۔ اس کے بعد غالب نے ۳۱ر ستمبر کو مرزا یوسف کے گھر لٹنے کی داستان بیان کی ہے۔ یہاں تک غالب نے صرف چار تاریخیں لکھی ہیں۔ یعنی ۱۱ر مئی (جب بغاوت شروع ہوئی) ۱۴ر ستمبر (جب انگریز دوبارہ دہلی میں داخل ہوئے) ۱۸ر ستمبر (جب انگریزوں کو دلّی پر کامل فتح حاصل ہوئی) اور ۳۱ر ستمبر (جب مرزا یوسف کا گھر لٹا)۔ ان میں ابتدائی تین تاریخیں وہ ہیں جو ہر شخص کی زبان پر تھیں۔ چوتھی، خود غالب کی زندگی سے متعلق تھی۔ دراصل ان تمام صفحات میں غالب نے کوئی خاص بات نہیں کہی۔ اگر وہ واقعی روزنامچہ لکھتے، تو قلعے کے تمام واقعات کو اس طرح نظر انداز نہ کر دیتے۔ انگریزوں کے نقطۂ نظر سے ان واقعات کو تاریخی ترتیب سے پیش کیا جا سکتا تھا۔ میرا خیال ہے کہ اوّل تو غالب کو تاریخیں یاد نہیں تھیں اور دوسرے، وہ عمداً قلعے کے واقعات بیان کرنے سے گریز کر کے یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ چونکہ اس دوران میں قلعے سے ان کا کوئی تعلق نہیں رہا، اس لیے انھیں دو تین مشہور واقعات کے علاوہ اور کچھ معلوم نہیں ہے۔ دستنبو روزنامچہ ہرگز نہیں ہے۔ اس سلسلے میں یہ دلایل

www.paknovels.com

پیش کیے جا سکتے ہیں :

۱- غالب نے واقعات کی تاریخی ترتیب غلط دی ہے۔ جس کا تفصیلی ذکر کیا جا چکا ہے۔

۲- غالب نے ۱۸ ستمبر کو ہجری تاریخ ۲۶ محرم بتائی ہے، جو غلط ہے۔

۳- مرزا یوسف کا گھر لٹنے کی تاریخ ۳۱ ستمبر (جمعہ) لکھی ہے۔ جب کہ ستمبر ۳۰ کا مہینہ ہوتا ہے اور یہ تاریخ ۳۰ ستمبر ہی ہے کیونکہ جمعہ اسی دن پڑتا ہے۔

۴- ۱۷ مارچ ۱۸۵۷ء کو بدھ کا دن لکھا ہے جو ٹھیک ہے۔ لیکن چند سطروں بعد ۱۸ مارچ کو جمعہ لکھا ہے جو غلط ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ جمعرات کا دن ہے۔

غالب کے قلم سے اس طرح اور بھی کئی سہو ہوئے ہیں۔

یہاں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ غالب نے دستنبو خالص فارسی زبان میں لکھی ہے، وہ تفتہ کو لکھتے ہیں :

"التزام اس کا کیا ہے کہ دساتیر کی عبارت یعنی پارسی قدیم لکھی جائے اور کوئی لفظ عربی نہ آئے۔ جو نظم اس میں درج ہے، وہ بھی بے آمیزشِ لفظِ عربی ہے۔ ہاں، اشخاص کے نام نہیں بدلے جاتے، وہ انگریزی، عربی، ہندی، جو ہیں، لکھ دیے ہیں[1]۔"

اس سلسلے میں ایک بات یہ ہے کہ خطوط اور روزنامچے مصنوعی زبان میں نہیں لکھے جاتے۔ جن لوگوں نے پُر تکلف اور پُر تصنّع زبان میں خطوط لکھے ہیں، ادب میں بھی ان کا وہی حال ہے۔ مثلاً رجب علی بیگ سرور کے خطوط اور فسانۂ عجائب کی زبان میں قطعاً فرق نہیں ہے۔ غالب نے یہ اہتمام کیا ہے کہ دستنبو میں عربی زبان قطعاً استعمال نہ ہو[2]۔ ایسی عبارت لکھنے کے لیے جس مزاج اور فرصت کی ضرورت ہوتی ہے،

۱- خطوطِ غالب، ص ص ۱۵۳ - ۱۵۴

۲- اگرچہ غالب اپنی اس کوشش میں ناکام رہے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو دستنبو کا ایک خاص نسخہ، سید جمیل الدین، نوائے ادب، جولائی ۱۹۵۵ء، ص ص ۵۱ - ۶۱

www.paknovels.com

روز نامچہ نگار اس سے محروم ہوتا ہے۔ دراصل غالب دستنبو کے ذریعے انگریزوں پر اپنی فارسی دانی کا رعب بھی جمانا چاہتے تھے۔

دستنبو کی تصنیف کا اصلی مقصد جاننے کے لیے خطوطِ غالب کا مطالعہ بہت ضروری ہے کیونکہ جو باتیں دستنبو میں نہیں کہی جا سکتی تھیں، وہ غالب نے اپنے خطوط میں لکھی ہیں۔ چونکہ اس تصنیف میں انقلاب کے واقعات بیان کیے گئے تھے، اس لیے خیال تھا کہ صاحبانِ مطبع کو اس کے چھاپنے میں تامّل ہوگا۔ تفتہ نے ایک خط میں یہ بات غالب کو لکھی۔ اس کے جواب میں غالب تفتہ کو لکھتے ہیں۔

"چھاپے کے باب میں جو آپ نے لکھا ہے، وہ معلوم ہوا۔ اس تحریر کو جب دیکھو گے، تب جانو گے۔ اہتمام اور عجلت اس کے چھپوانے میں اس واسطے ہے کہ اس میں ایک جلد نواب گورنر جنرل بہادر کی نذر بھیجوں گا، اور ایک جلد بذریعہ ان کے جناب ملکۂ معظمہ کی نذر کروں گا۔ اب سمجھ لو کہ طرزِ تحریر کیا ہوگی اور صاحبانِ مطبع کو اس کا انطباع کیوں نامطبوع ہوگا[۱]۔"

غلام غوث خاں بے خبر کے نام ایک خط میں تو غالب نے دستنبو کی تصنیف کا اصل مقصد بہت واضح الفاظ میں بیان کر دیا ہے۔ غالب نے انقلاب سے پہلے جو قصیدہ ملکۂ معظمہ کو بھیجا تھا، اس کے ساتھ خطاب، خلعت اور نمبر میں اضافہ کی درخواست کی تھی؛ اس کا ذکر کر کے غالب لکھتے ہیں:

"اب اس کتاب (دستنبو) اور دوسرے قصیدے کے جا بجا نذر کرنے کا یہ سبب ہے کہ سائل محکمۂ ولایت کو یاد دہی کرتا ہے۔ اور گورنمنٹ سے تحسین طلب ہے[۲]۔"

۱۔ خطوطِ غالب، ص ص ۱۵۴۔ ۱۵۵

۲۔ ایضاً، ص ۳۲۶

www.paknovels.com

۲۰ ستمبر تک دستنبو میں ملکۂ معظمہ کی مدح میں کوئی قصیدہ شامل کرنے کا غالب کو خیال نہیں تھا۔ انھوں نے ۲۰ ستمبر ۱۸۵۸ء کے خط میں حاتم علی مہر کو دستنبو کی تصحیح کتابت کے سلسلے میں ہدایات دی ہیں لیکن اس میں قصیدے کا کوئی ذکر نہیں تھا۔[۱] خط لکھنے کے بعد غالب کو خیال آیا کہ اس میں قصیدہ بھی شامل کر دیا جائے۔ چنانچہ اگلے ہی دن یعنی ۲۱ ستمبر کو حاتم علی مہر کو لکھتے ہیں :

"میں نے حضرت ملکۂ معظمہ انگلستان کی مدح میں ایک قصیدہ ان دنوں میں لکھا ہے۔ "تہنیتِ فتح اور عملداریِ شاہی"؛ ساٹھ بیت ہے۔ منظور یہ تھا کہ کتاب کے ساتھ قصیدہ ایک اور کاغذ مذہّب پر لکھ کر بھیجوں۔ پھر یہ خیال آیا کہ دس سطر کے مسطر پر کتاب لکھی گئی ہے، یعنی چھاپا ہوئی ہے۔ اگر یہ چھ صفحے یعنی تین ورق اور چھپ کر اس کتاب کے آغاز میں شامل ہو جائیں، تو بات اچھی ہے۔[۲]"

غالب نے تقریباً یہی بات ۲۲ ستمبر کو منشی نبی بخش حقیر کو بھی لکھی ہے۔[۳] اگرچہ انھوں نے لکھا ہے کہ انھوں نے یہ قصیدہ انھیں دنوں میں کہا تھا۔ یہ حقیقت نہیں ہے۔ مالک رام صاحب نے ثابت کیا ہے کہ اصل میں یہ قصیدہ بہادر شاہ ظفر کی مدح میں کہا گیا تھا۔ بعد میں اسے تھوڑی سی ترمیم و تنسیخ کے ساتھ ملکۂ معظمہ کی مدح میں کر دیا گیا۔ لطف یہ ہے کہ غالب نے اپنے عزیز ترین دوستوں سے بھی یہ حقیقت چھپائی ہے۔ اس قصیدے کے بارے میں مالک رام صاحب لکھتے ہیں :

"کلیاتِ مطبوعہ میں اس کا عنوان ہے۔ "سی ام قصیدہ در مدح شہنشاہِ انگلستان" علی گڈھ والے مخطوطے میں اس کا عنوان یہ ہے "در تہنیتِ غسلِ صحتِ حضورِ اقدس" اس قصیدے کا مطلع ہے :

۱۔ خطوطِ غالب ص ۱۰۳

۲۔ ایضاً، ص ۲۱۵ - ۲۱۶

۳۔ ایضاً، ص ۲۶۱

www.paknovels.com

در روزگارہا نتواند شمار یافت
خود روزگار آنچہ دریں روزگار یافت

بہادر شاہ ظفر ۱۸۵۳ء میں بہت بیمار ہو گئے تھے اور بہت دن تک بیمار رہے تھے۔ اس بیماری کے بعد غسلِ صحت کے موقع پر غالب نے قصیدہ کہا تھا۔ ممکن ہے کہ یہ وہی قصیدہ ہو۔ چونکہ اولاً یہ قصیدہ غسلِ صحت کے موضوع سے متعلق تھا۔ اس لیے جب غالب نے اسے ملکۂ وکٹوریہ سے منسوب کیا تو بعض لفظی تغیر و تبدل کے علاوہ، اس میں سے وہ شعر بھی نکال ڈالے، جن میں بادشاہ کی علالت اور صحت یابی کی طرف اشارہ تھا![1]"

غالب بہت ہی محتاط قسم کے آدمی تھے۔ انھوں نے نواب رامپور کو ۸ مارچ ۱۸۵۷ء اور یکم اپریل ۱۸۵۷ء کو دو خط لکھے تھے۔ ان دونوں خطوں کے لفافے دارالانشا رامپور میں محفوظ ہیں[2]۔ لیکن خط چاک کر دیے گئے ہیں۔ نواب رامپور کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ خود غالب کی فرمایش پر یہ خطوط چاک کیے گئے تھے[3]۔ محققین کا خیال ہے کہ ۱۸۵۷ء کے انقلاب کی تیاریاں کافی پہلے شروع ہو گئی تھیں؛ غالب نے اپنے خطوط میں غالباً انھیں تیاریوں کے سلسلے میں کچھ لکھا ہوگا۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ اگرچہ ہندستان میں انگریزوں کے خلاف بے چینی ضرور عام تھی۔ لیکن انقلاب کی تیاری کبھی نہیں ہوئی۔ اس کی ابتدا اچانک ہوئی۔ اس سلسلے میں ایک دلیل یہ بھی ہے کہ کیسے ممکن تھا کہ غالب کو تو ان تیاریوں کے بارے میں علم ہو گیا، لیکن قلعے میں بیٹھے ہوئے خود انگریزوں کے وفادار دوستوں مثلاً نواب زینت محل اور حکیم احسن اللہ خاں تک کو کچھ نہ معلوم ہو سکا۔ اگر ان دونوں میں سے کسی ایک کو بھی پتا چل گیا ہوتا تو

۱۔ مالک رام، غالب کے فارسی قصیدے، نقوش، مارچ ۱۹۶۳ء، ص ۲۳

۲۔ مکاتیب غالب، ص ۶

۳۔ ایضاً، ص ۱۲۱ (حواشی)

www.paknovels.com

ممکن نہیں تھا کہ وہ انگریزوں کو اس کی اطلاع نہ دیتے اور پھر انگریز اس کا سدِّ باب نہ کرلیتے۔

اس لیے میرا خیال ہے کہ غالب نے ۱۸۵۷ء کے معروف انقلاب کے بارے میں نہیں، بلکہ غالباً نواب واجد علی شاہ کی معزولی اور ریاست اودھ کے الحاق پر غم و غصّہ کا اظہار کیا ہوگا۔ یاد رہے کہ ایک ہی مہینے پہلے واجد علی شاہ نے غالب کا پانچ سو روپے سالانہ کا وظیفہ مقرر کیا تھا۔ میرے اس قیاس کی بنیاد اس خط پر ہے، جو غالب نے تقریباً انھیں ایّام میں (۲۳ فروری ۱۸۵۷ء) میر غلام حسین قدر بلگرامی کو لکھا تھا۔ غالب لکھتے ہیں:

"آپ ملاحظہ فرمائیں۔ ہم اور آپ کس زمانے میں پیدا ہوئے اور کس کی فیض رسانی اور قدر دانی کو کیا روئیں، اپنی تکمیل ہی کی فرصت نہیں۔ تباہیِ ریاستِ اودھ نے باآنکہ بیگانۂ محض ہوں، مجھ کو اور بھی افسردہ دل کر دیا۔ بلکہ میں کہتا ہوں کہ سخت ناانصاف ہوں گے۔ وہ اہلِ ہند، جو افسردہ دل نہ ہوئے ہوں گے۔ اللہ ہی اللہ ہے۔[1]"

اس لیے میرا خیال ہے کہ چونکہ غالب نے نواب رامپور کے نام خطوں میں اودھ کے بارے میں اپنے خیال کا اظہار کیا تھا، اس لیے انھیں چاک کر دینے کی فرمایش کی۔

انقلاب کے بعد جب غالب نے دوستوں اور شاگردوں کو خط لکھنا شروع کیا، تو ابتدا میں اچھی خاصی احتیاط سے کام لیا۔ انقلاب کے بعد ان کا پہلا خط ۵ دسمبر ۱۸۵۷ء کا ملتا ہے جو انھوں نے مرزا ہرگوپال تفتہ کو لکھا تھا۔ اس میں لکھتے ہیں:

"مفصّل حالات لکھتے ہوئے ڈرتا ہوں۔ ملازمانِ قلعہ پر شدّت ہے۔ بازپُرس اور دار و گیر میں مبتلا ہیں، مگر وہ نوکر جو اس ہنگام میں نوکر ہوئے ہیں؛ اور ہنگامے میں شریک رہے ہیں۔[2]"

غالب نے کئی خطوط میں اس خوف کا اظہار کیا ہے۔[3] اگر ذاتی خطوں میں اُن کا

۱۔ خطوطِ غالب، ص ۱۴۴

۲۔ خطوطِ غالب (مرتبہ مالک رام)، ص ۳۴

۳۔ مثلاً "زیادہ اس سے نہ تم لکھو گے، نہ میں لکھوں گا۔ بنام غلام نجف خاں — ۲۱ دسمبر ۱۸۵۷ء

(باقی ص ۱۰۱ پر)

www.paknovels.com

یہ رویہ ہے، تو دستنبو جو انگریزوں کو خوش کرنے کے لیے لکھی گئی تھی، اس میں کیا کیا احتیاط نہ کی گئی ہوگی! یہاں کچھ ایسی احتیاطوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔ اس حقیقت سے کون انکار کرسکتا ہے کہ دِلّی پر فتح کے بعد انگریزوں نے جو قتل عام کیا تھا، اس کے آگے نادر شاہ کی گردن بھی شرم سے جھک گئی ہوگی۔ مگر غالب انھیں انگریزوں کی بربریت اور وحشیانہ حرکتوں پر یہ کہہ کر پردہ ڈالتے ہیں۔

"دانم کہ دریں تاختت فرمانِ ہمہ آنست کہ ہر کہ گردن نہد، از سر خوش درگزرند، و اندوختہ ببرند؛ وہر کہ چیرہ شود، در نوردِ سرمایہ ستانی جانش نیز بشکرند۔ ہر آینہ برکشتگان گمان میرود کہ گردن کشیدہ اند، تا سر بر دوش ندیدہ اند۔۔۔۔ کشتنِ پیران وکودکان و زنان روا نداشتہ اند۔۔۔۔ و بر اندام زنان وکودکان تارِ موی نیازردند[۱]"

غالب نے دستنبو میں لکھا ہے کہ ۱۹/ اکتوبر کو میرزا یوسف (غالب کے چھوٹے بھائی) پانچ دن بخار میں مبتلا رہ کر وفات پاگئے[۲]۔ اب یہ ثابت ہوچکا ہے کہ مرزا یوسف طبعی موت نہیں مرے تھے، بلکہ انگریز کی گولی کا نشانہ بنے تھے۔ اس سلسلے میں دو شہادتیں موجود ہیں۔ معین الدین حسن خاں نے مٹکاف کی فرمایش پر ۱۸۵۷ء کے حالات خدنگ غدر کے نام سے لکھے تھے۔ انھوں نے مرزا یوسف کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

(صفحہ ۱۰۰ سے آگے) ۔ (خطوطِ غالب، ص ۳۷۰) (یہاں کا) حال لکھتے ہوئے ڈرتا ہوں۔ بنام شہاب الدین خاں۔ ۸ فروری ۱۸۵۸ء (خطوطِ غالب، ص ۱۰۶) قلم ہاتھ میں لیے پر جی بہت لکھنے کو چاہتا ہے، مگر کچھ نہیں لکھ سکتا۔ اگر مل بیٹھنا قسمت میں ہے، تو کہہ لیں گے، ورنہ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ بنام حکیم غلام نجف خاں، ۱۹ جنوری ۱۸۵۸ء (خطوط غالب، ص ۳۷۰)

۱- دستنبو، ص ۲۳-۲۴

۲- ایضاً، ص ۲۷

www.paknovels.com

"محلہ کھڑ کی فراشخانہ میں مولوی فرید الدین صبح کی نماز پڑھتے ہوئے مسجد میں مارے گئے۔ حکیم رضی الدین اور حکیم احمد حسین خاں بھی اسی طرح مع اپنے قاتلوں کے ملکِ عدم کو دست و گریباں روانہ ہوئے۔ مرزا یوسف برادرِ خورد اسد اللہ خاں غالب کہ قدیم سے مجنون تھے۔ حالت جنون میں گھر سے باہر نکل کے ٹہلنے لگے، وہ بھی مارے گئے اور کئی آدمی آبرودار نامی اس ہنگامۂ جرنیلی میں معرضِ قتل میں آ گئے"[۱]

حمید احمد خاں نے لوہارو خاندان کی ایک خاتون بگّا بیگم (مرزا زین العابدین خاں عارف کی بہو اور مرزا باقر علی خاں کامل کی بیوی) کا بیان نقل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یوسف مرزا اس کی گلی میں مارے گئے تھے[۲]۔ مالک رام صاحب اور قاضی عبد الودود صاحب دونوں نے اس بیان سے اتفاق کیا ہے[۳]۔ دراصل غالب یہ حقیقت صرف اس لیے چھپانا چاہتے تھے کہ کہیں اس سے ان کی انگریز سے وفاداری مشتبہ نہ ہو جائے۔ بقول "معین الدین حسن خاں، حکیم رضی الدین اور حکیم احمد حسین خاں بھی ... مع اپنے قاتلوں کے ملکِ عدم کو دست و گریباں روانہ ہوئے"۔ جس کا مطلب ہے کہ یہ دونوں لڑتے ہوئے مارے گئے تھے؛ اور انھوں نے بھی کچھ انگریزوں کو مارا تھا۔ میرزا یوسف مجنون تھے، اور ان کا انگریزوں سے لڑنے کا کوئی سوال نہیں تھا۔ لیکن بہرحال غالب کو یہ ڈر تھا کہ کہیں این ہم بچۂ شتر است کے مصداق میرزا یوسف کا شمار بھی انقلابیوں میں نہ ہو جائے ظاہر ہے کہ اس صورت میں غالب کے مستقبل پر اس کا بہت برا اثر پڑتا۔

غالب نے دستنبو میں حکیم احسن اللہ خاں کی جتنی تعریف کی ہے، اتنی کسی اور کی نہیں کی۔ غالب کو یقین تھا کہ انگریز حکیم صاحب سے بہت خوش ہیں۔ اس لیے اگر یہ ثابت

۱۔ خدنگِ غدر، ۱۴ الف، بحوالہ صحیفہ، غالب نمبر (۱۹۶۹ء)، ص ۲۷۱

۲۔ احوالِ غالب، ص ۸۷

۳۔ نوائے ادب (اپریل ۱۹۵۹ء)، ص ۱۱

www.paknovels.com

ہو جائے کہ ان کے غالب سے بہت اچھے تعلقات ہیں، تو اس کا ان کے معاملات پر خوشگوار اثر پڑے گا۔ یہ اور بات ہے کہ بعد کو حکیم صاحب بھی معتوب ہو گئے۔ اگر یہ واقعہ دستنبو کی تصنیف سے پہلے ہو گیا ہوتا تو یقین ہے کہ غالب ان کا نام تک نہیں لیتے۔[1] حکیم احسن اللہ خاں کے علاوہ غالب نے نواب رامپور اور مہاراجہ پٹیالہ کی بھی تعریف کی ہے اور اپنا ان سے تعلق اور انگریزوں سے ان کی وفاداری کا ذکر کیا ہے۔

پوری کتاب میں غالب کی یہ کوشش رہی ہے کہ وہ قلعے سے اپنی بے تعلقی اور اور بے نیازی ثابت کریں۔ اس سلسلے کی ایک کوشش یہ بھی ہے کہ غالب لکھتے ہیں کہ میں نے بادشاہ اور شاہزادوں کے بارے میں اس لیے کچھ نہیں لکھا کہ مجھے ابھی تک ان کے بارے میں کچھ علم نہیں۔[2] یہاں غالب راست گوئی سے کام نہیں لے رہے ہیں۔ کیونکہ دستنبو میں یہ بات ۱۹ اکتوبر (وفات میرزا یوسف) کے بعد لکھی گئی ہے۔ بہادر شاہ ظفر ۲۱ ستمبر کو گرفتار ہوئے تھے۔ اس کے دوسرے ہی دن ہاڈسن نے مرزا مغل، مرزا خضر اور ظفر کے پوتے مرزا ابوبکر کو قتل کر دیا تھا۔ اس کے بعد کئی دن تک شاہزادوں اور سلاطین کو قتل کیا جاتا رہا۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ ۱۹ اکتوبر کو یعنی ایک مہینے بعد تک غالب کو اس کا علم نہ ہوا ہو۔ (یہ اور بات ہے کہ خود دستنبو ۱۸۵۸ء میں لکھی گئی) غرض تین چار صفحے کے بعد غالب نے اپنی طرف سے ثابت کر دیا کہ مجھے بادشاہ اور شہزادوں سے قطعی دلچسپی نہیں۔

منشی شیو نرائن جو دستنبو چھاپ رہے تھے، انھوں نے کتاب کے آخر میں لکھ دیا کہ یہ "سرکار کی فتح کا حال" ہے۔ غالب کو معلوم ہوا، تو فوراً منشی شیو نرائن کو لکھا:

۱۔ ہوا بھی یہی۔ انگریزوں نے حکیم احسن اللہ خاں پر پہرہ بٹھا دیا تھا۔ جب وہ پہرہ اٹھا تو غالب حکیم غلام نجف خاں کو لکھتے ہیں۔ "تم کو مبارک ہو حکیم صاحب پر سے وہ سپاہی جو ان پر متعین تھا، اٹھ گیا جی ان کو دیکھنے کو چاہتا ہے مگر از روئے احتیاط جا نہیں سکتا۔" (خطوطِ غالب، مہر، ص ۶۹)

۲۔ "دستنبو" ص ۳۱

www.paknovels.com

"آخر کے صفحے کی دو سطریں از روے مضمون سراسر کتاب کے خلاف ہیں۔ میں نے سرکار کی فتح کا حال نہیں لکھا۔ صرف اپنی پندرہ مہینے کی سرگزشت لکھی ہے[۱]۔"

منشی شیونرائن نے وہی لکھا تھا، جو تاثر کتاب کے مطالعے سے قائم ہوتا ہے۔ لیکن غالب کو یہ پریشانی تھی کہ سرکار کی فتح کا حال لکھنے کا مطلب یہ ہوگا کہ غالب نے انگریزوں کی فتح کے بعد یہ کتاب لکھی ہے۔ جب کہ وہ ثابت یہ کرنا چاہتے تھے کہ یہ ان کا روزنامچہ ہے، جسے وہ اوّل روز ہی سے لکھ رہے تھے اور وہ ابتدا ہی سے انگریزوں کے ساتھ اور انقلابیوں کے خلاف تھے۔

غالب نے احتیاط کی حد تو اپنے خطابات کے ساتھ کی ہے۔ انھیں یہ خطابات بہادر شاہ ظفر نے دیے تھے، جس پر انھیں بڑا فخر تھا۔ لیکن ان بدلے ہوئے حالات میں وہ مصلحت اسی میں دیکھتے تھے کہ دستنبو پر ان کے نام کے ساتھ یہ خطابات نہ لکھے جائیں۔ چنانچہ مرزا تفتہ کو ہدایت دیتے ہیں:

"منشی شیونرائن کو سمجھا دینا کہ زنہار عرف نہ لکھیں۔ نام اور تخلّص بس۔ اجزاے خطابی کا لکھنا نامناسب، بلکہ مضر ہے۔ مگر ہاں نام کے بعد لفظ بہادر اور بہادر کے بعد تخلّص[۲]۔"

چنانچہ دستنبو کے پہلے اڈیشن پر اُن کا نام اس طرح لکھا گیا تھا:

"فردوسِ ہند نواب اسد اللہ خاں بہادر، غالب تخلص دہلوی"

لیکن جب ۱۸۶۵ء میں دستنبو کا دوسرا اڈیشن لٹریری سوسائٹی روہیلکھنڈ بریلی کے مطبع میں ہوا، تو اس پر ان کا نام اس طرح لکھا ملتا ہے:

"نجم الدولہ، دبیر الملک، اسد اللہ خان بہادر نظام جنگ المتخلص بہ غالب عرف مرزا نوشہ"

۱- خطوطِ غالب، ص ۲۳۷

۲- ایضاً، ص ۱۵۹

www.paknovels.com

سکّے کا الزام

دستنبو کی اشاعت کے چھ سات مہینے بعد غالب ایک بہت بڑی مصیبت میں گرفتار ہو گئے۔ ہوا یہ کہ تمام ناکامیوں کے باوجود غالب کو یقین تھا کہ وہ انگریزوں کی نگاہ میں بے گناہ ہوں گے۔ ۱۲ مارچ، ۱۸۵۷ء کو مرزا تفتہ کو لکھتے ہیں:

"بہر حال یہ خدا کا شکر ہے کہ بادشاہی دفتر سے میرا کچھ شمول فساد میں پایا نہیں گیا۔ اور میں حکّام کے نزدیک یہاں تک پاک ہوں کہ پنشن کی کیفیت طلب ہوئی ہے۔"[۱]

یہ ٹھیک ہے کہ دفترِ بادشاہی سے غالب کے ہاتھ کا کوئی کاغذ نہیں نکلا۔ لیکن یہ محض غالب کی خوش فہمی تھی کہ ان پر کوئی الزام نہیں ہے۔ غالب اپنی پنشن کے سلسلے میں دہلی کے کمشنر سے ملنے گئے تو یہ خوش فہمی بھی دور ہو گئی۔ انھوں نے اس کی تفصیل حسین مرزا کو ۱۸ جون ۱۸۵۹ء کو ان الفاظ میں لکھی ہے:

"بھاگا نہیں، پکڑا نہیں گیا، دفترِ قلعہ سے کوئی میرا کاغذ نہیں نکلا۔ کسی طرح کی بے حیائی اور نمک حرامی کا دھبّا مجھ کو نہیں لگا۔ یہاں ایک اخبار جو گوری شنکر یا گوری دیال یا کوئی اور غدر کے دنوں میں بھیجتا تھا، اس میں ایک خبر اخبار نویس نے یہ بھی لکھی کہ فلانی تاریخ اسد اللہ خان غالب نے یہ سکّہ کہہ کر گزرانا:

به زر زد سکّهٔ کشورستانی
سراج الدین بهادر شاهِ ثانی

مجھ سے عند الملاقات صاحب کمشنر نے پوچھا کہ یہ کیا لکھا ہے؟ میں نے کہا کہ غلط لکھا ہے۔ بادشاہ شاعر، بادشاہ کے بیٹے شاعر، بادشاہ کے

۱۔ ایضاً، ص ص ۱۴۷-۱۴۸

www.paknovels.com

نوکر شاعر، خدا جانے کس نے کہا، اخبار نویس نے میرا نام لکھ دیا۔ اگر میں نے کہہ کر گزرانا ہوتا، تو دفتر سے وہ کاغذ میرے ہاتھ کا لکھا ہوا نکلتا؟"

لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس الزام کی سنجیدگی اور اس کے نتائج و عواقب کے خیال سے ان کے حواس باختہ ہو گئے تھے۔ لامحالہ انھوں نے اپنے دوستوں سے اس کا ذکر کیا، تو میر روشن علی خان کے والد میر احمد حسین نے انھیں بتایا:

"حضرت جب بہادر شاہ تخت پر بیٹھے ہیں، تو میں مرشد آباد میں تھا۔ میں نے یہ سکّہ سنا تھا۔ ان کے کہنے سے مجھے یاد آیا کہ مولوی محمد باقر نے خبرِ وفاتِ اکبر شاہ و جلوسِ بہادر شاہ جہاں چھاپی تھی، وہاں اس سکّے کا گزرنا ذوق کی طرف سے چھاپا تھا[۲]"

غالب نے دہلی اردو اخبار کے اس شمارے کی بہت تلاش کی۔ اکثر دوستوں کو لکھا مگر بے سود۔ غرض ان پر یہ الزام برقرار رہا۔ سو سال تک محققینِ غالب یہی سمجھتے رہے کہ غالب ہی اس کے اصل مصنّف تھے اور انھوں نے مصلحتاً دروغ گوئی سے کام لیا تھا۔ مالک رام صاحب کو گوری شنکر کی (جو قلعے میں انگریزوں کا جاسوس تھا) لکھی ہوئی ایک رپورٹ نیشنل آرکائیوز سے ملی؛ جو اس نے پوشیدہ طور پر انگریزوں کو بھیجی تھی۔ یہ رپورٹ ۱۹ جولائی ۱۸۵۷ء کو لکھی گئی تھی۔ بہادر شاہ کے دربار کا ذکر کرتے ہوئے گوری شنکر نے لکھا ہے:

"دی روز (یعنی ۱۸ جولائی ۱۸۵۷ء) .... اسد اللہ خان غالب نے سکّۂ زر ایک پرچے پر لکھا؛ وہ یہ ہے:

بزر زد سکّۂ کشور ستانی
سراج الدین بہادر شاہ ثانی[۳]

۱۔ خطوطِ غالب، ص ص ۳۸۷-۳۸۸

۲۔ ایضاً، ص ص ۳۸۸-۳۸۹

۳۔ معارف (اگست ۱۹۵۸ء)، ص ۱۴۴

www.paknovels.com

یہی وہ رپورٹ ہے جس کی طرف کمشنر نے عند الملاقات اشارہ کیا تھا۔ اگر یہ رپورٹ درست تھی، تو اس سے واقعی ثابت ہوتا ہے کہ غالب پر یہ الزام بھی درست تھا۔ لیکن اسی مقالے میں مالک رام صاحب نے صادق الاخبار (۱۳ ذیقعدہ ۱۲۷۳ھ، جلد ۴ شمارہ ۱) کے حوالے سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ غالب پر اس سکّے کی تصنیف کا الزام بے بنیاد تھا۔ اس کے اصل مصنّف حافظ غلام رسول ویرآن شاگرد ذوق تھے۔ صادق الاخبار میں یہ خبر شائع ہوئی ہے[۱]:

"سکّۂ نوطبع زادِ جناب حافظ صاحب ویران شاگردِ رشید استاد ذوق مرحوم:

بزر زد سکّۂ کشورستانی
سراج الدین بہادر شاہ ثانی"

مزید بحث کرنے سے پہلے یہ بتانا ضروری ہے کہ گوری شنکر نے سکّہ کے متعلق یہ رپورٹ ۱۹ جولائی ۱۸۵۷ء کو لکھی تھی۔ اس واقعے سے چھ دن پہلے انگریزوں کے ایک اور جاسوس منشی جیون لال انگریزوں کو یہ اطلاع دے چکے تھے کہ:

(فتح آگرہ کے مژدے سے سب، بادشاہ و اہلِ قلعہ خوش تھے) "مرزا نوشہ اور مکرم علی خان نے ایک قصیدہ من تصنیف خود ہا بادشاہ کی مدح میں پڑھے ہیں[۲]۔

اس کی تصدیق اخبارِ عالمتاب سے بھی ہوئی ہے، جو آگرے سے شائع ہوتا تھا۔ اس اخبار نے لکھا ہے کہ:

"مرزا نوشہ اور مکرم علی خاں نے ۱۳ جولائی ۱۸۵۷ء کے دن بہادر شاہ کی تعریف میں قصیدے پڑھے تھے[۳]۔"

۱۔ معارف (اگست ۱۹۵۸ء)، ص ۱۴۹

۲۔ صحیفہ (غالب نمبر ۱۹۶۹ء)، ص ۲۷۲

۳۔ ایضاً، ص ۲۷۲

www.paknovels.com

اس کے تیئس[۲۳] دن بعد یعنی گیارہ اگست ۱۸۵۷ء کو غالب نے ایک اور قصیدہ پڑھا۔ جس کا ذکر عبد اللطیف ان الفاظ میں کرتے ہیں :

"۱۱ ؍ اگست ۱۸۵۷ء۔ نجم الدولہ اسد اللہ خان غالب نے ایک قصیدہ لکھ کر بادشاہ کو سنایا اور خلعت زیب تن کیا[۱]"

یہ حقیقت فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ غالب زمانۂ غدر میں (میرے خیال میں جب تک ہندستانیوں کا پلڑا بھاری رہا۔) دربار شاہی میں حاضر ہوتے رہے تھے۔ اگست کے وسط تک دلّی میں عام فضا یہی تھی کہ جیت ضرور ہندستانیوں کی ہوگی۔ اسی لیے غالب نے (اطلاعاتِ بالا کے مطابق) ظفر کی شان میں کم سے کم دو قصیدے پڑھے اور خاص طور پر اب تک کی معلومات کے پیشِ نظر انھوں نے پہلا قصیدہ اس وقت پڑھا، جب شاہی فوجوں کو آگرے پر فتح حاصل ہوئی تھی۔ آگرے میں انگریزوں کی شکست واضح طور پر ہندستان میں انگریزوں کی مکمل شکست کی نشاندہی کرتی تھی اور اسی واقعے نے غالب کو مدحِ ظفر کی جرأت دلائی۔

قصّہ کوتاہ، غالب کا خیال تھا کہ فتح بالآخر ہندستانیوں کی ہوگی۔ اس لیے انھوں نے بادشاہ کی مدح میں کم سے کم دو قصیدے پڑھے۔ لیکن ان پر جس سکّے کا الزام تھا، اس کے اصلی مصنّف غالب نہیں، حافظ ویران تھے۔

پروفیسر خواجہ احمد فاروقی نے روزنامچۂ جیون لال سے مندرجۂ ذیل عبارت نقل کی ہے، جو جیون لال نے ۱۹ مئی ۱۸۵۷ء کے تحت لکھی ہے :

"دربار شاہی منعقد ہوا۔ مولوی ظہور علی تھانے دار نے حاضر ہو کر ایک سکّۂ جلوس در بابتِ تخت نشینیِ حضور (میں) گزرانا..........

دیگر سکّۂ شعر ۔ مرزا نوشہ :

بر زرِ آفتاب و نقرۂ ماہ سکّہ زد در جہاں بہادر شاہ[۲]

۱۔ ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ، ص ۱۵۸

۲۔ صحیفہ (غالب نمبر ۱۹۶۹ء)، ص ۲۷۱

www.paknovels.com

گویا اب دو سکّے ایسے ہو گئے، جن کی تصنیف کا الزام غالب پر ہے۔ یہاں ایک دلچسپ بات کا ذکر ضروری ہے کہ مالک رام صاحب، پروفیسر فاروقی اور ان تمام محققوں نے جنھوں نے اس مسئلے پر روشنی ڈالی ہے، یہی تسلیم کیا ہے کہ غالب پر ایک سکّہ کہنے کا الزام تھا۔ ان تمام حضرات کی نظر غالب کے بعض خطوط پر نہیں گئی۔ یہ تو ٹھیک ہے کہ جب غالب کمشنر سے مل کر آئے تھے تو انھیں یہی بتایا گیا تھا کہ انھوں نے ایک سکّہ کہا تھا یعنی وہی۔ بزر زد سکّہ کشورستانی۔ الخ .... کچھ ہی دن بعد غالب کو معلوم ہوا کہ ان پر ایک نہیں، دو سکّے کہنے کا الزام ہے۔ غالب کو یہ خیال تھا کہ اُن پر جن سکّوں کا الزام ہے، وہ ذوق کی تصنیف ہیں۔ اس لیے ایک کی بجائے دو سکّوں کے اشاعت کی تلاش شروع ہوئی۔ غالب اپنے ایک دوست چودھری عبدالغفور سرور کو لکھتے ہیں:

"جناب چودھری صاحب آج کا میرا خط کاسۂ گدائی ہے یعنی تم سے کچھ مانگتا ہوں .... (دلی اُردو اخبار کے جس شمارے میں) بہادر شاہ کی تخت نشینی کا ذکر اور میاں ذوق کے دو سکّے ان کے نام کے کہہ کر نذر کرنے کا ذکر مندرج ہو۔ بے تکلّف وہ اخبار چھاپہ کا اصل بجنسہ میرے پاس بھیج دیجیے![1]"

ایک خط میں صریحاً لکھا ہے کہ مجھ پر دو سکّے کہنے کا الزام ہے۔ وہ چودھری عبدالغفور سرور کو لکھتے ہیں:

"سکّہ کا وار تو مجھ پر ایسا چلا، جیسے کوئی چھرا یا کوئی گراب[2] .... یہ دونوں سکّے ایک وقت میں کہے گئے ہیں یعنی جب بہادر شاہ تخت پر بیٹھے، تو ذوق نے دو سکّے کہہ کر گزارنے ..... اب یہ دونوں سکّے سرکار کے نزدیک میرے کہے ہوئے اور گزرانے ہوئے ثابت

۱۔ خطوطِ غالب، ص ۴۸۳

۲۔ توپ کا ایک خاص قسم کا گولا

www.paknovels.com

ہوئے ہیں[1]۔"

یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ غالب سکّہ کہنے کی اہمیت اور اس کے فن سے بخوبی واقف تھے۔ جنوری ۱۸۵۹ھ کے ایک خط میں وہ مہاراجہ سردار سنگھ والیِ بیکانیر کو لکھتے ہیں :

"سکّۂ مبارک کے تین نقشے بھیجتا ہوں۔ دو مع تصویر اور اس میں سکّہ منظوم یعنی ایک شعر جیسا کہ سلاطینِ ماضی کا ہر ملک میں دستور ہے اور ایک نثر۔ ان نقشوں میں سے جو نقشہ سری مہاراج کو پسند آئے، وہ حضور کو مبارک ہو[2]۔"

اگر غالب ایک مہاراجہ کے لیے اتنا کچھ کر سکتے ہیں، تو کیسے ممکن ہے کہ بہادر شاہ ظفر کا انھوں نے سکّہ نہ کہا ہو۔ نواب یوسف میرزا کو غالب جون ۱۸۵۹ء میں لکھتے ہیں :

"میں نے سکّہ کہا نہیں اور کہا تو اپنی جان اور حرمت بچانے کو کہا۔ یہ گناہ نہیں۔ اور اگر گناہ ہے بھی، تو کیا ایسا سنگین ہے کہ ملکۂ معظمہ کا اشتہار بھی اس کو نہ مٹا سکے۔ سبحان اللہ! گولہ انداز کا بارود بنانا اور توپیں لگانی اور بنک گھر اور میگزین کا لوٹنا معاف ہو جائے اور شاعر کے دو مصرعے معاف نہ ہوں۔ ہاں صاحب گولہ انداز کا بہنوئی مددگار ہے اور شاعر کا سالا بھی جانبدار نہیں[3]۔"

غالب کا یہ کہنا کہ "اوّل تو میں نے سکّہ کہا نہیں" ہرگز درخورِ اعتنا نہیں۔ غالب ایسے معاملوں میں مستقل دروغ گوئی سے کام لیتے ہیں۔ انھوں نے کئی بار اپنے

۱۔ خطوطِ غالب، ص ۵۰۴

۲۔ آجکل (فروری ۱۹۴۷ء)، ص ۱۰، نیز غالب کی نادر تحریریں، ص ص ۳۶-۳۷

۳۔ خطوطِ غالب، ص ۳۹۷

www.paknovels.com

دوستوں اور شاگردوں کو ذاتی خطوں میں لکھا ہے کہ غدر شروع ہوتے ہی میں نے خود کو گھر میں بند کر لیا تھا۔ جب کہ یہ ثابت ہو چکا ہے کہ ایّام غدر میں غالب قلعے جاتے رہتے تھے۔

ہمیں یہ بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ دورانِ غدر میں غالب نے کم سے کم دو قصیدے ظفر کی مدح میں پڑھے تھے۔ عبداللطیف نے ۲۵ مئی کے تحت لکھا ہے :

"ٹکسال کا کام منشی اجودھیا پرشاد کے سپرد کیا گیا ۔ ۔ ۔ ۔ اس کام میں نہایت اہتمام کیا گیا اور تیزی سے سکّہ بننا شروع ہوا۔ سکّہ کا چہرہ اس طرح روشن ہوا[۱]۔"

سکّہ زد در جہاں بفضلِ الٰہ
شاہِ ہندستاں بہادر شاہ

عبداللطیف نے اس سکّے کے مصنّف کا نام نہیں بتایا۔ میرا قیاس ہے کہ یہی سکّہ غالب کا کہا ہوا ہے۔ اگرچہ غدر کے زمانے میں کئی لوگوں نے سکّے کہے تھے[۲] لیکن

۱۔ ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ، ص ۱۲۹

۲۔ ایسے شواہد موجود ہیں کہ دورانِ غدر روپوں پر بعض ایسے سکّے کندہ کیے گئے تھے جن سے غالب کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ مثلاً لال قلعہ میں جب بہادر شاہ ظفر پر مقدمہ چلا تو حکیم احسن اللہ خاں نے گواہی دیتے ہوئے کہا تھا :

"تین یا چار باغی رجمنٹوں نے لکھنؤ سے بادشاہ کو درخواست بھیجی تھی اور یہ تحریر کیا تھا کہ ہم اودھ لینے کے بعد دہلی روانہ ہوں گے۔ ہم نے اس وقت انگریزوں کو بیلی گھاٹ پر گھیر رکھا ہے۔ قدرت اللہ خاں رسالہ دار جو سپاہیوں کے ساتھ اودھ کے رسالوں کی جانب سے یہ درخواست لایا تھا اسے بخت خاں نے بادشاہ کے روبرو پیش کیا۔ اس نے بادشاہ کے نام کا نیا سکّہ نذر کیا جس پر یہ عبارت کندہ تھی :

(ص ۱۱۲ پر)

www.paknovels.com

جو روپے دہلی میں تیار ہوتے تھے۔ ان پر غالب کے علاوہ کسی اور کا سکّہ لکھا جانا قرینِ قیاس نہیں۔ اوّل تو غالب کی حیثیت کا کوئی شاعر اُس وقت دہلی میں موجود نہیں تھا؛ ذوق اور مومن کا انتقال ہو چکا تھا۔ دوسرے، غالب نہ صرف درباری شاعر تھے، بلکہ ظفر کے استاد بھی تھے، اس لیے بھی احتراماً ضروری تھا کہ غالب ہی کا کہا ہوا سکّہ روپے پر لکھا جاتا۔ اس ایک سکّے کے علاوہ بھی امکان یہ ہے کہ غالب نے کچھ اور سکّے کہے ہوں۔ کیونکہ گوری شنکر اور جیون لال سکّہ نقل کرنے میں تو غلطی کر سکتے ہیں لیکن بے وجہ غالب پر الزام لگانے کی بظاہر کوئی وجہ نہیں۔ غالب نے گوری شنکر کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

"یہاں ایک اخبار گوری شنکر یا گوری دیال یا کوئی اور غدر کے دنوں میں بھیجتا تھا۔[۱]"

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ نہ صرف یہ کہ غالب کی گوری شنکر سے کوئی ذاتی مخاصمت

(ص ۱۱۱ سے آگے)

"سراج الدین بہادر شاہ غازی نے سونے کا سکّہ بیادگار فتح تیار کرایا۔"

(چراغ دہلی، ص ۲۴۲)

اس بیان کی تصدیق خدنگِ غدر سے ہوتی ہے جس میں اصل سکّہ بھی نقل کیا گیا ہے۔ معین الدین حسن خاں لکھتے ہیں:

"بریلی سے خان بہادر خاں نذر و عرضی بھیجی۔ بادشاہ کی طرف سے خلعت مرحمت ہوا۔ لکھنو سے مرزا عباس نذر تاجِ سلطانی مع روپیہ و اشرفی سکّہ بہادر شاہی، سکّہ

بزر زد سکّہ نصرت طرازی
سراج الدین بہادر شاہ غازی

(خدنگِ غدر، ص ص ۷۹-۸۰)

۱- خطوطِ غالب، ص ۳۸۸

www.paknovels.com

نہیں تھی بلکہ وہ اس سے واقف بھی نہیں تھے۔ اس لیے میرا خیال ہے کہ جن تاریخوں میں جیون لال (۱۹ مئی ۱۸۵۷ء) اور گوری شنکر (۸ اجولائی ۱۸۵۷ء) نے لکھا ہے کہ غالب نے سکّہ کہا، غالب نے واقعی سکّے کہے تھے۔ چونکہ ان دنوں ہر چھوٹا بڑا شاعر سکّہ کہہ رہا تھا۔ اس لیے ان دونوں جاسوسوں نے غلط سکّے نقل کر دیے۔ آخر میں ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔ میرا قیاس ہے کہ غالب نے جتنے بھی سکّے کہے سب کے سب زبانی پیش کیے ہوں گے۔ اگرچہ عام فضا یہ تھی کہ جیت ہندستانیوں کی ہوگی، مگر پھر بھی دور اندیشی کا تقاضا یہی تھا کہ اپنی تحریر نہ دی جائے۔ انگریزوں نے دہلی فتح کرنے کے بعد قلعے کے تمام کاغذات اپنے تصرّف میں لے لیے تھے۔ ان میں سے بعض کاغذات نیشنل آرکائیوز میں میری نظر سے گزرے ہیں۔ غدر کے دنوں میں شاہی دربار میں جو روزنامچہ لکھا جاتا تھا، وہ بھی نیشنل آرکائیوز میں محفوظ ہے۔ لیکن ان میں غالب کی کوئی تحریر میری نظر سے نہیں گزری۔ پھر غالب نے کئی بار یہ بات اپنے خطوں میں دہرائی ہے کہ دفتر قلعہ سے کوئی میرا کاغذ نہیں نکلا . . . . اگر میں نے کہہ کر گزرانا، تو دفتر سے وہ کاغذ میرے ہاتھ کا لکھا ہوا نکلتا۔ (خطوط ص ۳۰۸) یا بہرحال خدا کا شکر ہے کہ بادشاہی دفتر سے میرا کچھ شمول فساد میں پایا نہیں گیا۔ (خطوط ص ۱۴۷) اگر غالب کی کوئی تحریر دفتر شاہی میں ہوتی، تو غالب اس اعتماد اور یقین کے ساتھ یہ بات نہ کہتے۔ گوری شنکر نے البتہ یہ لکھا ہے کہ "غالب نے ایک سکّہ، ذرپرچے پر لکھا"۔ گوری شنکر نے یہ نہیں کہا کہ پرچے پر لکھ کر بہادر شاہ ظفر کو پیش کیا۔ امکان یہ ہے کہ غالب نے وہیں بیٹھے بیٹھے دو مصرعے کہے۔ پرچے پر لکھ کر بادشاہ کو سنائے اور پرچہ اپنے پاس ہی رہنے دیا۔ دستنبو میں غالب نے انگریزوں کی مدح میں جو کچھ کہا ہے اور ہندستانیوں کی جس انداز سے مذمت کی ہے، وہ غالب کے دل کی آواز نہیں ہے، محض مصلحت ہے اس انقلاب اور اس کے اثرات کے بارے میں غالب کے اصلی خیالات جاننے کے لیے ان کے خطوط واحد معتبر ماخذ ہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ غالب کو بہادر شاہ ظفر اور شہزادگانِ تیموریہ سے قطعاً دلچسپی

www.paknovels.com

نہیں تھی۔ خطوطِ غالب میں کہیں کوئی ایسی بات نہیں ملتی، جس سے یہ پتا چلے کہ قلعے کی بربادی کا غالب کو کوئی صدمہ تھا۔ بلکہ انقلاب سے پہلے جس قلعے کو وہ قلعۂ مبارک کہتے تھے اُسے انھوں نے قلعۂ نامبارک کہا ہے[1]۔ انگریزوں نے بہادر شاہ ظفر اور ان کے خاندان پر جو ظلم و ستم کیے تھے، جس طرح شہزادوں کو بے رحمی سے قتل کیا تھا، خطوطِ غالب میں ان کا کہیں ذکر نہیں۔ بادشاہ کی وفات کی خبر پڑھ کر غالب ۲ نومبر ۱۸۶۲ء کو میر مہدی مجروح کو لکھتے ہیں:

"اودھ اخبار میں بادشاہ کے مرنے کی خبر لکھی دیکھی، مگر پھر کہیں سے تصدیق نہیں ہوئی[2]۔"

لگ بھگ ڈیڑھ مہینے بعد یعنی ۱۶ دسمبر ۱۸۶۲ء کو غالب لکھتے ہیں:

"۷ نومبر۔ ۱۴ جمادی الاول سالِ حال (۱۲۷۹ھ - ۱۸۶۲ء) جمعہ کے دن ابوالمظفر سراج الدین بہادر شاہ قیدِ فرنگ و قیدِ جسم سے آزاد ہوئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون[3]۔"

ان دونوں مقامات پر غالب نے محض ایک واقعہ بیان کیا ہے، اس واقعے سے متعلق اپنے تاثرات کا قطعی اظہار نہیں کیا۔

البتہ نواب علاء الدین احمد خاں علائی کے نام ایک خط میں غالب نے قلعے کے لوگوں کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

"معزول بادشاہ کے ذکور جو بقیۃ السیف ہیں، وہ پانچ پانچ روپے مہینہ پاتے ہیں۔ اناث میں سے جو پیرزن ہیں کٹنیاں، اور جو جوان

۱۔ غالب نے نومبر ۱۸۵۹ء میں یوسف مرزا کو لکھا ہے: "پوچھو کہ کیا غم ہے۔ غمِ مرگ، غمِ فراق، غمِ رزق، غمِ عزت، غمِ مرگ میں قلعۂ نامبارک سے قطعِ نظر کر کے اہلِ شہر کو گنتا ہوں۔ (خطوطِ غالب، ص ۲۴۳)

۲۔ خطوطِ غالب، (مالک رام)، ص ۳۳۲

۳۔ ایضاً، ص ۳۳۳

www.paknovels.com

ہیں کسبیاں[۱]۔"

تفتہ کے نام ایک خط میں غالب نے ان کی تضمین . . . . یعنی شبستان کو بیگمات قلعہ سے ان الفاظ میں تشبیہہ دی ہے۔ لکھتے ہیں :

"ہائے، کیا بُری کاپی ہے۔ اپنے اشعار کی اور اس کاپی کی مثال جب تم پر کھلتی کہ یہاں ہوتے اور بیگماتِ قلعہ کو پھرتے چلتے دیکھتے۔ صورتِ ماہِ دو ہفتہ کی سی اور کپڑے میلے، پائینچے لیرلیر، جوتی ٹوٹی[۲]۔"

اگرچہ غالب کو اہلِ قلعہ سے دلچسپی نہیں تھی، مگر یہ ممکن نہیں تھا کہ انگریزوں نے جس طرح دہلی میں قتل و غارت گری کی، غالب اس سے متاثر نہ ہوئے ہوں۔ لیکن ذاتی خطوط میں بھی وہ بہت احتیاط سے کام لینے کے عادی تھے۔ مثلاً ۵ دسمبر ۱۸۵۷ء کو مرزا ہر گوپال تفتہ کو لکھتے ہیں :

"مبالغہ نہ جاننا امیر غریب سب نکل گئے (دلی سے)، جو رہ گئے تھے، وہ نکالے گئے۔ گھر کے گھر بے چراغ پڑے ہیں[۳]۔"

ظاہر ہے کہ لوگ صرف دلی سے نکلے ہی نہیں تھے، بلکہ بے شمار قتل بھی ہوئے تھے لیکن غالب نے یہاں اس کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ وہ عام طور پر مکانوں اور بازاروں کے ڈھائے جانے اور دہلی کے بے رونق ہونے کا ماتم کرتے ہیں۔ انگریزوں نے جو قتل و غارت گری کی تھی، اس کا ذکر غالب نے صرف دو آدمیوں، نواب علاء الدین احمد خاں علائی اور حکیم غلام نجف خاں کے خطوں میں کیا ہے۔ وہ ان دونوں کے علاوہ کسی کو قابلِ اعتبار نہیں سمجھتے۔ حیرت تو یہ ہے کہ مرزا ہر گوپال تفتہ اور میر مہدی مجروح کے سے عزیز شاگردوں کو بھی کوئی قابلِ گرفت بات نہیں لکھی۔ نواب علاء الدین احمد خاں علائی

۱۔ خطوطِ غالب، ص ۷۰

۲۔ ایضاً، ص ۱۹۳

۳۔ ایضاً، ص ۵۳

www.paknovels.com

کے نام ۱۸۵۸ء کے ایک منظوم خط میں یہ شعر بھی ہیں:

بسکہ فعّالِ ما یُرید ہے آج
ہر سلحشور انگلستان کا
چوک جس کو کہیں، وہ مقتل ہے
گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا
شہر دہلی کا ذرہ ذرۂ خاک
تشنۂ خوں ہے ہر مسلماں کا[1]

حکیم غلام نجف خاں سے چونکہ گھریلو تعلقات تھے۔ اس لیے ان کے نام اپریل ۱۸۵۸ء کے ایک خط میں انگریزوں کے قتل و غارتگری پر اس طرح بالواسطہ تبصرہ کیا ہے:

"اس فتنہ و آشوب میں تو شاید کوئی میرا جاننے والا نہ بچا ہوگا"[2]

۱۸۶۰ء میں، جب انقلاب کے اثرات کچھ کم ہو گئے تھے، ایک دفعہ غالب کے قلم سے ان کے دل کی بات نکل ہی گئی۔ نواب انور الدولہ شفق کو لکھتے ہیں:

"پانچ لشکر کا حملہ پے درپے اس شہر پر ہوا۔ پہلا، باغیوں کا لشکر۔ اس میں اہل شہر کا اعتبار لٹا۔ دوسرا لشکر خاکیوں کا۔ اس میں جان و مال و ناموس و مکان و آسمان و زمین و آثارِ ہستی سراسر لٹ گئے ...[3]"

۱۔ خطوطِ غالب، ص ۳۷۴
۲۔ ایضاً، ص ۳۷۲
۳۔ ایضاً، ص ۳۵۹

www.paknovels.com

اردو مکتوب نگاری کی ابتدا

اور

غالب

ہر زبان کی طرح اُردو میں بھی نظم کو پہلے مقبولیت حاصل ہوئی اور نثر کی طرف توجہ بہت بعد میں دی گئی۔ انیسویں صدی کے آغاز تک عام قاعدہ یہ تھا کہ شعر و شاعری کے لیے اُردو اور نثر کے لیے فارسی کا استعمال کیا جاتا۔

میر تقی میر جیسے اُردو کے خدائے سخن نے اپنی آپ بیتی فارسی ہی میں لکھی اور شاعروں کے تذکرے ایک مدت تک فارسی ہی میں لکھے جاتے رہے۔ میر تقی میر کے 'نکات الشعرا' (سنہ تصنیف تقریباً ۱۷۵۲ء) اور فتح علی حسینی گردیزی کے 'تذکرہ ریختہ گویان' سے لے کر وجیہہ الدین عشقی کے 'تذکرہ عشقی' (سنہ تصنیف ۱۸۰۱ء) تک اُردو شاعروں کے تذکروں کی تعداد اچھی خاصی ہے۔ لیکن یہ سب فارسی میں لکھے گئے ہیں۔ اب تک کے دستیاب شدہ تذکروں میں مرزا علی لطف کا 'گلشنِ ہند' (سنہ تصنیف ۱۸۰۱ء) پہلا تذکرہ ہے جو اُردو زبان میں لکھا گیا اور یہ تذکرہ بھی فورٹ ولیم کالج کی عام پالیسی کا مرہونِ منت ہے۔ کیونکہ گلکرسٹ کی فرمائش پر لطف نے علی ابراہیم خلیل کے 'تذکرہ گلزارِ ابراہیم' کا ترمیم، حذف اور اضافے کے

www.paknovels.com

ساتھ ترجمہ کیا تھا۔ اسی زمانے میں حیدر بخش حیدری نے "تذکرہ گلشن ہند" اُردو میں لکھا۔ ان دو تذکروں کے بعد تقریباً چالیس سال تک اُردو شاعروں کے جو تذکرے لکھے گئے۔ اُن کی زبان فارسی ہی ہے۔ ۱۸۴۴ء میں مولانا امام بخش صہبائی نے اُردو شاعروں کا ایک تذکرہ انتخاب دواوین کے نام سے اُردو میں لکھا۔ لطف یہ ہے کہ وہ خود فارسی کے شاعر تھے اور ان کے اُردو کلام میں چند ہی اشعار ملتے ہیں غالباً انھوں نے یہ تذکرہ دہلی کالج کے زیر اثر لکھا، جہاں وہ ملازم تھے۔ ۱۸۴۵ء میں کریم الدین نے "گلدستۂ نازنین" لکھا اور اس کے بعد اُردو میں تذکرے لکھنے کا عام رواج ہوگیا اور فارسی میں معدودے چند تذکرے ہی لکھے گئے۔

فورٹ ولیم کالج کے قیام سے قبل شمالی ہند میں نثر میں گنتی کی کتابیں لکھی گئیں۔ فضل علی فضلی نے ملا حسین واعظ کاشفی کی روضۃ الشہدا کا کربل کتھا کے نام سے ۱۱۴۵ھ میں اُردو ترجمہ کیا۔ اور ۱۱۶۱ھ میں اس پر نظر ثانی کی۔

مرزا محمد رفیع سودا نے میر محمد تقی مرثیہ گو کے ایک مرثیہ اور ایک سلام پر منظوم اعتراضات کیے اور اس کی ابتدائی عبارت اُردو نثر میں لکھی![1]

اسی زمانے میں محمد حسین کلیم نے محی الدین ابن عربی کی نصوص الحکم کا اُردو ترجمہ کیا۔ شاہ عالم بادشاہ نے ۱۲۰۷ھ میں عجائب القصص لکھنی شروع کی تھی جو کچھ عرصہ بعد مکمل ہوئی[2]

۱۔ محمد حسین آزاد نے 'آب حیات' میں لکھا ہے کہ "سودا نے میر تقی میر کی مثنوی "شعلۂ عشق" کو اُردو نثر میں لکھا تھا۔" آزاد کا یہ بیان مشکوک ہے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: خلیق انجم، مرزا محمد رفیع سودا، علی گڑھ، ۱۹۶۶ء، ص ۴۴۲ - ۴۴۳

۲۔ یہ کتاب راحت افزا بخاری نے مرتب کر دی ہے۔ جسے جنوری ۱۹۶۵ء میں مجلس ترقی ادب لاہور نے شائع کیا ہے۔

www.paknovels.com

۱۲۰۲ھ (۸۹ - ۱۷۸۸ء) میں مہر چند کھتری مہر نے فارسی میں لکھے گئے قصّہ ملک محمد و گیتی افروز کو اُردو جامہ پہنایا۔ اور اس کا نام "آئینِ ہندی" رکھا۔ سیّد شاہ حقانی نے ۱۲۰۶ھ میں قرآن شریف کی تفسیر لکھی۔

سیّد حسین شاہ حقیقت کے بڑے بھائی سید محمد حسن شاہ نے ایک نوجوان کی سچّی المیہ کہانی فارسی میں لکھی تھی۔ جسے حقیقت نے ۱۲۱۱ھ یا ۱۲۱۲ھ (۹۸-۱۷۹۷ء) میں 'جذبِ عشق' کے نام سے اُردو میں ترجمہ کیا!

اس کے بعد اُردو نثر کا عہدِ زریں آتا ہے۔ یعنی کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج وجود میں آیا۔

اس کالج کا مقصد انگریزوں کو ہندوستانی زبان سکھانا تھا۔ اسی مقصد سے یہاں اُردو میں بہت سے تراجم اور تالیفات شائع کی گئیں۔ میر امن کی باغ و بہار اور گنج خوبی، کاظم علی جوان کی شکنتلا ناٹک، نہال چند لاہوری کی 'مذہب عشق'، شیر علی افسوس کی 'باغِ اُردو'، حیدر بخش حیدری کی 'توتا کہانی' اور 'آرایشِ محفل'، شیخ حفیظ الدین کی 'خرد افروز'، بہادر علی حسینی کی 'اخلاقِ ہندی'، وغیرہ کی اشاعت اسی کالج کی مرہونِ منّت ہے۔ ان کتابوں کی زبان اہلِ اُردو کے مزاج کے خلاف تھی۔ اس لیے عام طور پر انھیں پسند نہیں کیا گیا۔ لیکن یہ اُن حکمرانوں کی کوششوں کا نتیجہ تھیں جن کی تہذیب، علم اور مادّی ترقی نے ہندستانیوں کی آنکھوں کو خیرہ کر رکھا تھا۔ اس لیے ممکن نہیں کہ ہندستانی ذہن فورٹ ولیم کالج کی مطبوعات سے متاثر نہ ہوا ہو۔

۱۲۴۰ھ میں رجب علی بیگ سرور نے "فسانۂ عجائب" لکھی۔ اس کتاب کی بنیادی زبان وہی ہے جس کی ابتدا فورٹ ولیم کالج نے کی تھی۔ البتہ کہیں کہیں سرور بھٹک جاتے ہیں۔ لیکن ایسے مقام پوری کتاب میں بہت کم ہیں۔

یہی وہ زمانہ ہے جب انشاء اللہ خاں انشا نے "سلک گوہر" اور "رانی کیتکی"

۱۔ نیر مسعود رضوی، رجب علی بیگ سرور، الٰہ آباد، ۱۹۶۷ء، ص ۵۵

www.paknovels.com

اور کنور اودے بھان کی کہانی" لکھیں۔ مولانا عبدالقادر دہلوی نے قرآن شریف کا اُردو ترجمہ کیا۔ جس کے ساتھ ایک تفسیر بھی تھی۔ اس کی تکمیل ۱۸۰۸ء میں ہوئی۔ لیکن ۱۸۲۲ء میں یہ کتاب شائع ہوئی۔

یہاں سید احمد بریلوی کے ایک مرید مولوی کرامت علی جونپوری کا ذکر بھی ضروری ہے۔ انھوں نے ان غیر اسلامی رسم و رواج اور روایتوں کے خلاف جدوجہد کی جو اسلام میں داخل ہو گئی تھیں۔ اس سلسلے میں انھوں نے مشرقی بنگال میں باقاعدہ تبلیغ شروع کی۔ اور اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے بہت سی کتابیں اردو میں لکھیں۔ رد الدعت، ہدایت العارفین، مکاشفاتِ رحمت، حجت قطعی اور فیضِ عام ان کی چند مشہور کتابیں ہیں۔ کہا جاتا ہے انھوں نے چھیالیس سے اوپر کتابیں لکھی تھیں۔ ان کی ابتدائی تصانیف ۱۸۲۴ء لغایت ۱۲۴۰ھ متحرک ٹائپ میں چھپی تھیں[1]۔

جدید اُردو نثر کی تاریخ میں دہلی کالج کی خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ۱۸۴۳ء میں انجمن اشاعتِ علوم بذریعہ السنہ ملکی (VERNACULAR TRANSLATION SOCIETY) کا قیام عمل میں آیا۔ اس سوسائٹی کے بانی کچھ افراد تھے اور اس کی حیثیت ایک پرائیوٹ ادارے کی تھی۔ کچھ دن بعد اس سوسائٹی کو دہلی کالج سے ملحق کر دیا گیا۔ اس سوسائٹی نے بہت سی کتابوں کا اُردو ترجمہ کرایا۔ اور بہت سی کتابیں لکھوائیں۔ مولانا عبدالحق نے ۱۱۱ کتابوں کی فہرست دی ہے جو اس سوسائٹی نے شائع کی تھیں[2]۔ سوسائٹی کا بنیادی اصول یہ تھا کہ ترجمہ اس طرح کیا جائے کہ طالب علم آسانی سے سمجھ لے۔ اس سوسائٹی کی سب سے بڑی دین یہ ہے کہ اس نے نثر میں سادگی اور فطری حسن کو فروغ دیا۔

جس طرح ہر زبان میں نظم پہلے وجود میں آئی ہے اور نثر بعد میں۔ اسی طرح نثر کے وجود میں آنے اور اچھی خاصی مقبولیت حاصل کرنے کے بعد مکتوب نگاری جنم

۱۔ عبداللہ یوسف علی، انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ، کراچی، ۱۹۶۶ء، ص ۱۹۹

۲۔ مرحوم دہلی کالج، مولانا عبدالحق، اُردو (جولائی ۱۹۲۳ء) ص ص ۴۸۶ - ۴۸۷

www.paknovels.com

لیتی ہے۔ ہندستان میں چونکہ صدیوں فارسی کو سرکاری زبان کا مرتبہ حاصل رہا ہے۔
اس لیے مکتوب نگاری کی زبان بھی فارسی رہی۔ اور اگر کسی نے بھولے بھٹکے اُردو میں
خط لکھا بھی تو منظوم۔

اُردو ادیب اور شاعر نثری مکتوب نگاری کے لیے فارسی کا استعمال کرتے رہے
خود غالب نے تیس چالیس سال تک فارسی ہی میں خط لکھے۔ ان بزرگوں کے
پیشِ نظر امیر خسرو، ابوالفضل، ملّا محمد طاہر وحید، فیضی، ظہوری، بیدل اور نعمت خانِ
عالی کے مکاتیب تھے۔ اس لیے وہ ان مکتوب نگاروں کے نقش قدم پر چلتے
رہے۔

جب اُردو میں مکتوب نگاری کا آغاز ہوا تو یہاں بھی وہی اصول وضوابط کارفرما
رہے۔ جو فارسی میں وضع ہوئے تھے اور انھیں خصوصیات کو برتا گیا جو فارسی مکتوب
نگاری کے لیے ضروری تھیں۔ خط کا خاکہ کچھ اس طرح ہوتا۔ بہت طویل القاب وآداب
کے بعد مکتوب الیہ اور اس کے متعلقین کی خیریت پوچھی جاتی۔ اپنی خیریت سے مطلع
کیا جاتا۔ بعض اوقات مکتوب الیہ کی خیریت، تندرستی اور ترقی کی دعا مانگی جاتی۔ اب
اظہارِ مطلب ہوتا۔ اور آخر میں پھر دعائیہ جملے ہوتے۔ اظہارِ مطلب میں لمبے لمبے فقرے
ہوتے۔ اندازِ بیان انتہائی پرشکوہ ہوتا۔ دور از قیاس تشبیہات واستعارات کا
استعمال کیا جاتا۔ عبارت کو رنگین بنانے کے لیے بے تکلف اور تصنع اور مرصع
کاری سے کام لیا جاتا۔ کوشش کی جاتی کہ عبارت مقفیٰ اور مسجع ہو۔ نازک خیالی، معنی
آفرینی، کثرتِ مترادفات، دقّت و اغلاق کو اس فن کی خوبی سمجھا جاتا۔

اُردو میں فن مکتوب نگاری پر کئی کتابیں لکھی گئیں یا فارسی سے ترجمہ ہوئیں۔
حیدرآباد کی آصفیہ لائبریری میں محمد لطیف کی دستور النثر محفوظ ہے۔ اول کتاب فارسی
میں تھی۔ اس کا ترجمہ دکنی میں محمد خاں نامی ایک شخص نے کیا تھا۔ اس کے علاوہ غلام محمد غوث
کی دستور الہدایت اور نظام الدین کی فن انشا بھی محفوظ ہیں۔ ان کتابوں میں اس فن کے
جو اصول بیان کیے گئے ہیں۔ وہ فارسی سے مستعار ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ تینوں

www.paknovels.com

کتابیں اس وقت لکھی گئی ہیں۔ جب غالب اُردو میں خط لکھنا شروع کر چکے تھے۔ بلکہ غالب کو اُردو میں خط لکھتے ہوئے تقریباً بیس سال ہو چکے تھے۔ جب غلام امام شہید کی کتاب انشائے بہارِ بے خزاں ۱۸۶۶ء میں شائع ہوئی۔ جس میں وہ لکھتے ہیں :۔

"۔۔۔ اور بہت فارسی اور عربی کی کتابوں کا ترجمہ اُردو میں ہو گیا، اور داستان اور کہانیاں عجیب و غریب لکھی گئیں اور لکھی جاتی ہیں اور خط و کتابت کا دستور اردو اب تک جاری نہیں۔ پھر اگر اب کوئی زبان اُردو میں اس کا رواج دیا چاہے تو جس طرح نظم اور نثر فارسی کے طور پر جاری ہوئی۔ اسی طرح خط و کتابت کا بھی فارسی کے طور پر جاری ہونا ضروری ہوگا اور فارسی میں جو خط لکھنے کے قاعدے مقرر ہیں ناچار اُردو میں بھی اسی کا بھی تابع ہونا پڑے گا۔"[۱]

آگے چل کر شہید خط کے ارکان بتاتے ہیں جو ان کے خیال کے مطابق اکیس ہیں :

"مقدمہ القاب، القاب، ادعیہ، آداب، تحیت، اشتیاقیہ، ملاقاتیہ، صنعت علاقیہ، اظہاریہ، خطوں کے نام، خطوں کی رسید، ادراکیہ، کاتب کا نام، مکتوب الیہ کے نام، دوسرے شخص کی صفت، چیز کا بھیجنا، چیز کا مانگنا، اپنا آنا، مکتوب الیہ کا آنا یا جانا، مطلب اور خاتمہ۔"[۲]

خود غالب نے جب ۱۸۲۵ء میں مکتوب نگاری پر ایک کتاب پنج آہنگ کے آہنگ اول، دوم، سوم لکھے تو آہنگِ اول میں فارسی انداز پر اصول بیان کیا ہے۔ اگر بیٹا باپ کو خط لکھے تو بقولِ غالب القاب یہ ہونا چاہیے۔

"قبلہ کونین و کعبہ دارین حضرت ولی نعمی مدظلہ العالی آداب بندگی و تسلیم

۱۔ غلام امام شہید، انشائے بہارِ بے خزاں، کانپور، ۱۹۱۱ء، ص ۲۲

۲۔ ایضاً، ص ۲۴

www.paknovels.com

کہ حصول سعادتیاں در بیانی در گرد انست بتقدیم رسانیدہ معروض می دارد[1]"

اس کے بعد فقرات خیریت آتے ہیں۔ غالب نے ایک نمونہ کا فقرۂ خیریت یوں لکھا ہے:

بعنایت الٰہی و توجہات نامتناہی آن امید گاہ حال عقیدت سگال بخواست و سلامت و صحت ذات حمیدہ صفات ہموارہ از جناب واہب المطلبات خواہاں می باشد۔[2]

اُردو مکتوب نگاری پر مزید گفتگو سے پہلے ضروری ہے کہ چند اہم امور پر روشنی ڈالی جائے۔ انگریز بہت عرصے سے چاہتے تھے کہ فارسی کی جگہ دیسی زبانوں کو سرکاری حیثیت دی جائے۔ جس کی غالباً ایک وجہ یہ بھی تھی کہ فارسی کے سرکاری زبان ہوتے ہوئے انگریزوں کو اپنی مادری زبان کے علاوہ دو زبانیں اور سیکھنی پڑتی تھیں۔ ایک تو سرکاری زبان یعنی فارسی اور دوسری وہ دیسی زبان جس میں وہ اہلِ ہند سے گفتگو کر سکیں۔ دیسی زبانوں کو سرکاری زبان بنانے سے انگریزوں کے لیے فارسی پڑھنا ضروری نہ رہتا تھا۔ اس کے برعکس ہندستان میں فارسی کے زوال کے باوجود ہندستانی اردو کو کم مایہ اور بے بضاعت زبان سمجھتے تھے۔ اس لیے وہ راضی نہ تھے کہ اُردو کو سرکاری زبان بنایا جائے۔ اس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ شاہ عالم اور کلایو کے درمیان دیوانی بنگالہ کی تفویض کی شرائط طے ہوئی تھیں۔ ان میں ایک اہم شرط یہ بھی تھی کہ فارسی سرکاری زبان کی حیثیت سے قائم رہے گی۔ لطف یہ ہے کہ شاہ عالم نہ صرف خود اُردو کے شاعر تھے، شمالی ہند کے ابتدائی نثر نگاروں میں بھی ان کا شمار ہوتا ہے۔

اٹھارویں صدی کے اختتام پر اُردو کے لیے فارسی ٹائپ رائج ہوا۔ اس

۱۔ اسد اللہ خاں غالب، کلیاتِ نثرِ غالب، طبع دوم، مطبع نولکشور، ۱۸۷۱ء، ص ۶

۲۔ کلیاتِ نثرِ غالب، ص ۷

www.paknovels.com

ٹائپ میں متعدد اُردو کتابیں چھپیں۔ ۱۸۳۷ء میں پہلا لیتھو پریس ہندستان میں قائم ہوا۔ جس کی وجہ سے اُردو میں چھپنے والی کتابوں میں اچھا خاصا اضافہ ہوا۔ ۱۸۳۹ء میں سرکاری اور انتظامی امور کے لیے دیسی زبانوں کا استعمال شروع ہوا۔ لیکن فارسی بھی جاری رہی۔ ۱۸۴۰ء میں ڈاک کا ٹکٹ ایجاد ہوا جس نے مراسلت کی رفتار میں غیر معمولی اضافہ کیا۔ ۱۸۴۳ء میں دہلی کالج میں VERNACULA TRANSLATION SOCIETY (جس کا اردو نام انجمنِ اشاعتِ علوم بذریعہ السنہ ملکی تھا) کا قیام عمل میں آیا۔ ۱۸۴۴ء میں سرکاری امور کے لیے فارسی کا استعمال قطعی بند کر دیا گیا۔

۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج کا قیام اُردو نثر کی ترقی کی پہلی سیڑھی تھی۔ آہستہ آہستہ حالات اُردو نثر کے حق میں بہتر ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ ۱۸۴۴ء میں اُردو نثر کو وہ مقام حاصل ہو گیا جو صدیوں سے فارسی کی قسمت میں تھا۔ ۱۸۴۴ء اُردو نثر کی تاریخ میں اہم ترین سال ہے۔ اب تک اُردو نثر کا بیشتر سرمایہ فورٹ ولیم کالج کا مرہونِ منت تھا۔ کالج سے باہر جو کتابیں لکھی گئیں، ان کی تعداد بہت کم تھی اور پھر صرف فسانۂ عجائب ایک ایسی اُردو نثر کی کتاب تھی جسے شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی۔ یہ کتاب کافی عرصے تک صاف اور سادہ نثر کے راستے میں حائل رہی۔ اسی کے اثر سے نثری کتابیں بلکہ نجی خطوط بھی مقفیٰ لکھے جانے لگے تھے۔ ۱۸۴۴ء میں جب فارسی کا استعمال قطعی بند ہو گیا اور صرف انگریزی اور دیسی زبانیں (شمالی ہند میں اُردو) باقی رہ گئیں تو مجبوراً اُردو کی طرف توجہ کرنی پڑی۔ اُردو کے عدالتی اور سرکاری زبان ہونے سے کیا اثر پڑا، اس کا اندازہ ان حقایق سے لگایا جا سکتا ہے کہ ۱۸۰۱ء سے ۱۸۴۴ء تک اُردو میں صرف پانچ اخباروں کا اجرا ہوا۔ اور تقریباً اکیس چھاپے خانے وجود میں آئے۔ جبکہ صرف ۱۸۴۵ء میں پانچ اخبار جاری ہوئے اور گیارہ چھاپے خانے وجود میں آئے۔ ۱۸۴۸ء میں یہ تعداد بہت بڑھ گئی۔ اس سال سولہ اخباروں کا اجرا ہوا[1]۔ ابتدا میں بتایا جا چکا ہے کہ ۱۸۴۴ء سے قبل صرف دو تذکرے

۱۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: محمد عتیق صدیقی 'ہندوستانی اخبار نویسی'، علی گڑھ، ۱۹۵۰ء، ص ص ۴۵-۴۵۲

www.paknovels.com

اُردو زبان میں لکھے گئے، باقی سب فارسی میں تھے۔ جبکہ ۱۸۴۴ء اور اس کے بعد فارسی میں لکھے جانے والے تذکروں کی تعداد تین چار سے زیادہ نہیں۔ باقی سب اُردو میں لکھے گئے۔

یہ ہیں وہ حالات جن میں اُردو مکتوب نگاری کی باقاعدہ ابتدا ہوتی ہے۔ اس عہد کے قابلِ ذکر مکتوب نگار ہیں: رجب علی بیگ سرور، غلام غوث خاں بے خبر، غلام امام شہید، واجد علی شاہ اور ان کی بیگمات اور غالب۔

اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ ان حضرات سے قبل اُردو میں خط بالکل نہیں لکھے گئے۔ پروفیسر خواجہ احمد فاروقی نے مرزا جان طپش (متوفی ۱۸۱۴ء) کا ایک خط راسخ عظیم آبادی (متوفی ۱۸۲۲ء) کے نام اور راسخ کا جواب دونوں نقل کیے ہیں۔ خواجہ صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ گارساں دتاسی اُردو میں خط وکتابت کرتا تھا۔ اس کے خطوط پیرس کی لائبریری میں محفوظ ہیں[1]۔ ظاہر ہے کہ ان لوگوں کے علاوہ بھی کچھ اور لوگوں نے اردو میں خط لکھے ہوں گے جو ہم تک نہ پہنچ سکے۔

یہ کہنا بہت مشکل، بلکہ تقریباً ناممکن ہے کہ بے خبر، شہید، سرور اور غالب میں کس نے پہلے اُردو میں مراسلت شروع کی اور تاریخی اعتبار سے تقدم کا شرف کس کو حاصل ہے۔ میں اس بحث کو بے معنی سمجھتا ہوں کیونکہ ناممکن ہے کہ غالب نے اوائل زندگی میں اُردو میں کوئی ایسی تحریر نہ لکھی ہو جسے ہم خط کہہ سکیں۔ ٹھیک اسی طرح یہ بھی ممکن نہیں کہ بے خبر، شہید اور سرور نے اُردو میں باقاعدہ مکتوب نگاری سے قبل کچھ اور خطوط نہ لکھے ہوں۔

انگریزی سیاست اور تعلیمی پالیسی نے باقاعدہ اُردو مکتوب نگاری کو جنم دیا۔ چونکہ اہل اُردو کے سامنے صرف فارسی کے نمونے تھے اس لیے انھوں نے فارسی انشا ہی

۱۔ پروفیسر خواجہ احمد فاروقی، مکتوباتِ اُردو کا ادبی اور تاریخی ارتقا، تحقیقی مقالہ، دلی یونیورسٹی لائبریری، ص ۵، ۔ ص ۷۲

www.paknovels.com

کا تتبع کیا۔ جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے اُردو مکتوب نگاری کے آغاز میں دو رجحان تھے۔ ایک تو وہ جو فارسی انشا کا تتبع پسند کرتا تھا اور دوسرا وہ رجحان تھا جو مغرب کے زیر اثر اُردو میں آیا تھا۔ جسے مختصر الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے۔" مختصر اور سادہ بلکہ روزمرّہ کی زبان میں کام کی بات" اس رجحان کی ابتدا فورٹ ولیم کالج سے ہوئی تھی جہاں اُردو کتابوں کی تالیف و ترجمہ کا مقصد صاحبانِ انگریز کو اُردو پڑھانا تھا۔ دہلی میں جب دہلی کالج قایم ہوا اور مختلف علوم کی کتابوں کا اُردو ترجمہ کیا گیا تب بھی یہی اصول پیشِ نظر رہا۔ اس کالج میں پہلی بار مغربی علوم کو ترجموں کے ذریعہ ہندستانیوں تک پہنچایا گیا۔ ماسٹر رام چند اور ان کے شاگرد نذیر احمد، ذکاءاللہ اور محمد حسین آزاد، اسی کالج کے پروردہ ہیں۔ جدید نثر کے فروغ میں ان تمام لوگوں کا ناقابلِ فراموش حصّہ ہے۔ مکتوب نگاری میں اسلوب کی سادگی اور اختصار کے اس رجحان کو سب سے زیادہ تقویت اُردو کے عدالتی اور سرکاری زبان ہونے سے ملی۔ چونکہ عام طور سے سرکاری عہدوں پر انگریز فائز تھے۔ وہ سادگی بیان کو محمد شاہی روشوں پر ترجیح دیتے تھے۔ کیونکہ مشکل، پُرتکلف، مقفّیٰ اور مسجع عبارت کو سمجھنا ان کے لیے آسان کام نہیں تھا۔

پروفیسر خواجہ احمد فاروقی نے ایک کتاب فارسی اور اُردو کی انشا مع ترجمہ انگریزی کا ذکر کیا ہے۔ یہ کتاب نعمت خاں منشی اکبر آبادی اور ٹی۔ ایچ۔ جی بینٹ نے مرتب کی تھی اور انگریزی میں ترجمہ کیا تھا۔ ۱۸۴۳ء میں کلکتہ سے یہ کتاب شائع ہوئی تھی۔ پوری کوشش کے باوجود مجھے یہ کتاب نہیں مل سکی۔ میرا قیاس ہے کہ اس کتاب کی بنیاد مکتوب نگاری کے جدید اصولوں پر ہوگی۔ کیونکہ ایک انگریز اس کتاب کا مددگار مرتب ہے۔ اس بحث کا مقصد یہ ثابت کرنا ہے کہ مکتوب نگاری میں سہل پسندی اور سادگی بیان کے رجحان کو تھوڑی بہت مقبولیت ضرور حاصل ہو چکی تھی۔" اور کیسی زبان لکھی جائے" یہ موضوع زیر بحث رہتا تھا، پڑھا لکھا طبقہ اس موضوع پر بحث کرتا تھا۔ ماسٹر رام چندر نے مہتمم سید الاخبار کے نام ایک خط لکھا تھا جو

www.paknovels.com

۲۴ر اگست ۱۸۴۶ء کے فوائد الناظرین میں شائع ہوا تھا۔ اس خط میں ماسٹر رام چندر نے اُردو زبان کے متعلق یہ بنیادی سوال اُٹھایا تھا۔

"اصل اُردو کیا ہے اور وہ کون سے الفاظ زبان فارسی اور عربی اور سنسکرت کے ہیں کہ ان کا ہی فقط استعمال اُردو میں مناسب ہے اور باقی نامناسب ہے[1]۔"

ماسٹر رام چندر کا عقیدہ تھا کہ اُردو اسلوب کو آسان، سادہ اور فطری بنانے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ عربی، فارسی اور سنسکرت کے الفاظ کا استعمال کم سے کم کیا جائے اور صرف ان الفاظ کا استعمال کیا جائے جو اُردو میں کھپ سکیں۔ اسی خط میں آگے چل کر وہ لکھتے ہیں :

"یہ بات دیکھی گئی ہے کہ اگر لکھنے والا عربی خواں ہے تو وہ اپنی عبارت اُردو میں عربی الفاظ زیادہ لاتا ہے اور جو فارسی خواں ہے وہ فارسی کے الفاظ بہت کام میں لاتا ہے اور جو سنسکرت فقط جانتے ہیں وہ الفاظ سنسکرت کا بہت استعمال کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں سوائے الفاظ کے بہت سے اشخاص اکثر فارسی خواں محاورے اور اصطلاحیں زبان فارسی کی اُردو عبارت میں مندرج کرتے ہیں اور اس کو عین خوبی عبارت کی تصور کرتے ہیں اور اب ظاہر ہے کہ اس طرح کی عبارتوں کو تو اُردو نہیں کہہ سکتے[2]۔"

ماسٹر رام چندر نے فن مکتوب نگاری پر "طریقۂ خط و کتابت" کے عنوان سے اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھا ہے :

۱۔ فوائد الناظرین، ۲۴ر اگست ۱۸۴۶ء، بحوالہ ماسٹر رام چندر، صدیق الرحمٰن قدوائی، دہلی، ۱۹۶۱ء، ص ۱۳۸

۲۔ ایضاً، ص ۱۳۹

www.paknovels.com

"اول میں خط کے لمبے چوڑے القاب، بعد اس کے آداب، تسلیمات و شرحِ اشتیاق پانچ چار دس بیس سطروں میں، بعد اس کے حال خیریت و عافیت چار سطروں میں، پھر شکایت نہ پہنچنے خط کی طرح طرح سے، اور بے قرار اور مضطر ہونا جس کا بالکل اثر نہیں ہوتا یا حال پہنچنے خط کا اور سرفراز و ممتاز ہونا، پھر تھوڑا مطلب بڑی عبارت میں، یا بعضے خطوں میں سوائے امورِ مذکورہ اور کچھ بیان نہیں ہوتا تو اس کے سب آشنایوں کو آسامی وار سلام کہتے ہیں۔ اکثر امرا بلکہ عوام میں دستور ہے کہ مبادا دوسرا آدمی شکایت کرے کچھ نہ کچھ لکھ کر جس میں مطلب کی ایک بات نہیں ہوتی۔ البتہ انشا پردازی اور عبارت آرائی میں حتی الوسع دریغ نہیں ہوتا، بھیج دیتے ہیں۔ خطوط تہنیت و تعریف کے دفتر کے دفتر ہوتے ہیں۔ بعضے خطوں میں دیکھا کہ مضمون نہایت عتاب کا ہے لیکن القاب و آداب سے شرف و عظمت و اخلاق و محبت ٹپکتا ہے عبارت مضمون کی یہ ہے کہ آں صادق الوردد فلاں امر نہایت قبیح کردند، آئندہ چناں نکنند و از صدور چنیں امر معلوم شد کہ آں مہرباں را با ما عداوتے تامہ است، لیکن القاب میں مشفقِ مہربان دکرمفرمائے مخلصاں، و مخلصِ اخلاص پرستاں وغیرہ اور آداب میں، بعد تمنا حصول و مواصلت کہ حدے و پایانے ندارد و اظہارِ لوازم تسلیم و عبودیت" وغیرہ مندرج ہے۔ ایک خط ۲۳ سطر کا میں نے دیکھا جس میں مضمون صرف اتنا تھا کہ قریب چار ساعت نواحقہ بر غریب خانہ تشریف آرند۔ پرچہ یہ اس مضمون کو بھی بڑی دھوم دھام سے لکھا تھا۔[۱]"

مکتوب نگاری پر یہ مقالہ بہت بعد میں شائع ہوا تھا لیکن اس میں جو اصول

۱۔ محب ہند، دسمبر ۱۸۴۹ء، جنوری ۱۸۵۰ء، بحوالہ ماسٹر رام چندر، ص ص ۱۴۰۔ ۱۴۱

www.paknovels.com

بیان کیے گئے ہیں۔ ان پر عمل کافی عرصے سے کیا جارہا تھا۔

دہلی اُردو اخبار، فوائدالناظرین اور قرآن السعدین میں پڑھنے والوں کے جو خطوط شائع ہوتے تھے۔ وہ عام طور پر صاف اور سادہ زبان میں ہوتے۔ ان میں انشاپردازی کی بجائے کام کی باتیں اختصار کے ساتھ لکھی جاتیں۔ فوائدالناظرین کے ۲۹ جون ۱۸۴۶ء کے شمارے میں ایک خط شائع ہوا تھا۔ اس کا اقتباس ملاحظہ ہو:

"میری رائے ناقص میں سوائے اس کے کہ ان اشعار کی سماعت کرنے سے شوق واسطے لغویات کے اور نفرت واسطے علوم اور فنون مفیدہ کے پیدا ہوجائے اور کوئی نہیں معلوم ہوتی ہے۔ سوائے اس کے دل پر ایک طرح کی سستی اور بے پروائی ہوجاتی ہے اور وہ جو باتیں شجاعت اور مردانگی کی ہیں ان کے مزاج میں سے اُٹھ جاتی ہیں حقیقت تو یہ ہے کہ یہاں کے اشعار اس لائق ہیں کہ انھیں عیاش اور اوباش سنا کریں کیونکہ ان کے ذریعے سے انھیں زیادتی لذت کی حاصل ہوسکتی ہے۔ اب ہم پوچھتے ہیں کہ اگر یہی صاحب جو اتنا ذہین اور قوت رکھتے ہیں کہ نہایت عالی مضمون کے اشعار مثلاً ایسے جن کو سننے سے ایک طرح کی مردانگی اور شجاعت دل پر آوے بنادیں تو خلقت ہندوستان کو کس قدر فائدہ ہوسکتا ہے۔ اگر حال ملکِ فرنگ کا کسی کو معلوم ہوگا کہ اس پر یہ بات روشن ہوگی کہ بعض کتابِ نظم کے مطالعہ کرنے سے لوگوں کے مزاج بدل گئے ہیں...

الراقم سیاح[۱]۔"

اس خط سے ایک بات تو یہ ثابت ہوتی ہے کہ حالی نے شاعری کے بارے میں مقدمہ شعروشاعری میں جو خیالات پیش کیے ہیں۔ وہ کوئی نئی چیز نہیں تھے۔ یہ خط

۱۔ فوائدالناظرین، ۲۹ جون ۱۸۴۶ء، بحوالہ ماسٹر رام چندر

www.paknovels.com

مقدمہ شعر و شاعری کی اشاعت سے لگ بھگ نصف صدی قبل لکھا گیا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ لوگ مغربی ادب اور خیالات سے کافی عرصے پہلے سے متاثر ہو رہے تھے۔ دوسرے یہ خط سادگیِ بیان کے رجحان کا ترجمان ہے۔

اب ہم مکتوب نگاری میں پہلے رجحان یعنی مشکل پسندی اور انشا پردازی کے علمبرداروں کے فن کا جائزہ لیتے ہیں۔

غلام امام شہید۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے شہید نے اُردو مکتوب نگاری کی بنیاد ہی فارسی انشا پر رکھی تھی۔ انھوں نے خط کو ارکانِ خط کے حصار میں باندھ کر بالکل بے اثر بلکہ مہمل بنا دیا ہے۔ انشائے بہار بے خزاں میں خطوط کے جو نمونے دیے گئے ہیں۔ اُن میں صرف عبارت آرائی ہے۔ نثر میں شاعری کی گئی ہے۔ اور کثرتِ مترادفات نے خط کو بے اثر بنا دیا ہے۔ جس طرح شمالی ہند میں اُردو شاعری کو ایہام کے خارزاروں سے گزرنا پڑا تھا۔ اس طرح اُردو مکتوب کو فطری حُسن حاصل کرنے کے لیے تصنّع، بناوٹ اور طرح طرح کی شعبدہ بازیوں سے گزرنا پڑا۔ غلام امام شہید نے مکاتیب کے جو نمونے دیے ہیں ان میں سے بعض میں کچھ صنعتوں کا استعمال کیا گیا ہے۔ مثلاً ایسے مکاتیب بھی ہیں :

۱۔ رقعہ کہ جس میں ہندی کے سوا کوئی لفظ عربی اور فارسی نہیں۔

۲۔ رقعہ جس میں ہندی اور فارسی کے سوا عربی کا کوئی لفظ نہیں۔

۳۔ رقعہ جس میں ہندی اور عربی کے سوا فارسی کا کوئی لفظ نہیں۔

۴۔ رقعہ الف سے خالی۔

۵۔ رقعہ جس میں ب کا حرف نہیں آیا۔

۶۔ رقعہ جس کے کسی لفظ کے پڑھنے میں ہونٹھ سے ہونٹھ نہیں ملتا۔

۷۔ رقعہ جس کے ہر کلمے میں سوا حروف رابطہ کہ جزوِ کلمے کے حساب میں ہیں۔ ہونٹھ سے ہونٹھ نہیں ملتا۔

۸۔ صنعتِ منقوطہ۔

www.paknovels.com

۹۔ رقعہ غیر منقوطہ
۱۰۔ ایک حرف منقوط، ایک حرف غیر منقوط۔
۱۱۔ ایک لفظ منقوط، ایک غیر منقوط۔
۱۲۔ رقعہ جس میں سب نقطے نیچے ہیں۔
۱۳۔ رقعہ جس میں سب نقطے اوپر ہیں۔
۱۴۔ رقعہ نظم اور نثر دونوں میں پڑھا جاتا ہے![1]

ایسے رقعے بھی ہیں جن میں اصل بات تلازموں میں کہی گئی ہے۔ مثلاً

۱۔ رقعہ قرأت کے تلازمے میں
۲۔ رقعہ شطرنج کے تلازمے میں
۳۔ رقعہ گنجفے کے تلازمے میں[2]

ایک ایسے خط میں جس میں کسی صنعت کا استعمال نہیں کیا گیا۔ شہید صرف اتنا کہنا چاہتے ہیں: "جب سے تم گئے ہو بہت یاد آتے ہو!" اب دیکھیے کس طرح اس بات کو محض کثرتِ مترادفات اور مبالغہ آرائی سے غیر موثر بنا دیا ہے۔ لکھتے ہیں:

مرغِ جاں کو قفسِ تن سے رہائی ہوتی
لیکن اس جانِ جہاں سے نہ جدائی ہوتی

شفیق میرے جس دن سے آپ کلکتے تشریف لے گئے ہیں لکھنؤ کا شہر میری آنکھوں میں اُجاڑ اور گھر مجھے ایک کالا سا پہاڑ معلوم ہوتا ہے اور بیٹھتا ہوں تو جگر میں درد بے اختیار ایسا اُٹھتا ہے کہ بے چین

۱۔ انشائے بہارِ بے خزاں، ص ص ۵۴ - ۵۷
۲۔ ایضاً، ص ص ۶۷ - ۶۸ - اس غیر فطری انداز پر پوری پوری کتابیں مرتب کی گئی تھیں۔ منشی محمد جعفر نے "انشائے عجیب" لکھی تھی۔ جس میں یہ اہتمام تھا کہ کوئی عربی لفظ نہ آئے منشی کامتا پرشاد نے "انشائے بے نقاط" مرتب کی تھی۔

www.paknovels.com

ہو کر اُٹھ کھڑا ہوتا ہوں تو ناتوانی سے تھرتھرا کر ناچار بیٹھ جاتا ہوں۔ رونگٹا رونگٹا بدن میں نشتر سا چبھتا ہے اور کلیجہ آٹھ آٹھ پہر آگ کے انگارے کی طرح پھکتا ہے۔ کھانا پینا چھوٹ گیا اور دل کے زخم کا ٹانکا ٹوٹ گیا۔ نیند تو خواب میں بھی صورت نہیں دکھاتی۔ اب موت بھی مجھ سے آنکھ چراتی ہے۔ دن کو بے پانی کی مچھلی کی طرح تڑپتا ہوں۔ رات کو کروٹیں بدل کر کانٹوں پر لوٹتا ہوں۔ میں تو بہتیرا اپنے تئیں سنبھالوں۔ لیکن بقول مصحفی صاحب کے دل کو کیا کروں۔

دل کے دھڑکے کا یہ عالم ہے کہ بے منتِ دست
پُرزے ہو ہو کے گریبان اُڑا جاتا ہے

افسوس کی بات ہے کہ میرا تو آپ کی یاد میں یہ حال ہے اور آپ نے ایسا مجھے دل سے بھلایا کہ کبھی پیام اور سلام سے بھی یاد نہ فرمایا۔ خدا کے واسطے اپنی خیریت سے مطلع فرمایئے اور خوش خبری ملاقات کی جلد سنایئے اور اگر ممکن ہو تو ایک گھڑی تحفہ لے کر بھجوایئے کہ جدائی کے رنج کے تارے تو گنتا ہی رہوں۔ اب ہر ساعت آپ کے انتظار میں گھڑی سے دم شماری کیا کروں[1]"۔

مہمل گوئی کی حد تک یہ مبالغہ آرائی غزل کے راستے سے مکتوب نگاری میں داخل ہوئی ہے۔

واجد علی شاہ اور ان کی بیگمات کے خطوط

جب انگریزوں نے واجد علی شاہ کو معزول کر کے کلکتہ جلاوطن کر دیا تو بہت سی بیگمات لکھنؤ ہی میں رہ گئیں۔ ان بیگمات اور واجد علی شاہ میں صرف خط و کتابت

۱۔ انشائے بہارِ بے خزاں، ص ص ۳۸ - ۳۹

www.paknovels.com

کا تعلق رہ گیا۔ اس وقت میرے پیشِ نظر "بیگماتِ اودھ کے خطوط" اور رقعاتِ بیگمات ہیں۔ ان مجموعوں میں تین طرح کے خطوط ہیں :

۱۔ منظوم

۲۔ منثور

۳۔ منظوم و منثور

یہ خطوط حور بیگم، شیدا بیگم، فاطمہ بیگم، دلپذیر بیگم، مہدی بیگم، منور بیگم، فرخندہ محل، کنیز فاطمہ، نواب وزیر، امراؤ بیگم، منا جان بیگم، نوروزی بیگم، سلیمان محل، شہنشاہ بیگم، نواب خاص محل، خرد محل، سرفراز بیگم، یاسمین محل، وزیر دل آرا بیگم، نشاط محل، فخر محل، بدرعالم، سردار پری، خسرو محل، عمدہ محل اور نگار محل وغیرہ غرض تین درجن سے اوپر بیگمات کے خطوط واجد علی شاہ اور واجد علی شاہ کے خطوط بیگمات کے نام ہیں۔ ان خطوط میں اُس عورت کی جھلک دکھائی دیتی ہے جو جاگیر داری طبقہ کے ہاتھوں ذلیل و خوار تھی۔ جس کی ساری زندگی ایک ایسے انسان سے محبت کی بھیک مانگتے گزر جاتی جو وفا سے نا آشنا ہوتا۔ اور جو دولت کے بل پر دنیا کی ہر خوبصورت عورت پر اپنا پیدائشی حق سمجھتا۔

ان تمام خطوط کو اختصار سے یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ ہم تمھاری جدائی میں مرتے ہیں۔ خدا تم سے ملاقات کرائے۔ اور تم کو تمھارا تخت و تاج واپس دلوائے ان خطوط میں محبت ہے نہ خلوص۔ صرف اس شخص کی تمنا ہے جسے شاید تخت و تاج واپس مل جائے۔ مکتوب نگار کے پاس کہنے کو کوئی بات نہیں۔ صرف جدائی کے دُکھڑوں کو طرح طرح سے بیان کیا گیا ہے۔ شیدا بیگم کا ایک خط ملاحظہ ہو۔ کہنا صرف یہ ہے کہ بہت دن سے تمھارا خط نہیں آیا۔

"فلک بارگاہ، انجم سپاہ، ماہ لقا، مہر ضیا، مشتری خصائل، عطارد رقم، بہتر سے بہتر، جانِ عالم اختر، ہمیشہ رہے اُلفت تمھاری، اور خدا جلد تر دکھائے صورت تمھاری، عرصہ دراز گزرا کہ گلدستہ گلستانِ محبت

www.paknovels.com

اور نوبادہ بوستانِ مودّت، درج وفا کا گوہر، برجِ ولا کا نیر، دافع صدمات آلام، ہمارے دل کا آرام، یعنی نامہ نامی اور نمیقہ گرامی تمہارا، ہزار سے پیارا، غیرتِ عنبر سارا، تسلی دینے والا ہمارا، نہ آیا، آتشِ الم نے خرمنِ عیش و راحت کو جلایا، دل نہایت گھبرایا، عجب طرح کا صدمہ اُٹھایا کہ غنچہ خاطر پژمردہ پایا، چین کسی دم نہیں ملتا ہے، دل سینہ میں ہلتا ہے، فوجِ اندوہ و الم نے لوٹا ہے، خواب و خور چھوٹا ہے، دم پر بنی ہے، شغلِ سینہ زنی ہے، حال تمھاری صحت کا نہ معلوم ہوا اور مژدہ خیریت کا نہ مفہوم ہوا، دل کمال مضطر ہے، جانِ حزیں آتی لب پر ہے ......[1]"

اس خط میں صرف مضمون آرائی ہے جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ ان خطوط کا اندازِ بیان وہی ہے جو غلام امام شہید کے خطوط کا ہے یعنی نثر میں شاعری کی گئی ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ میاں بیوی کی یہ راز و نیاز کی باتیں اکثر بیگمات نے خود نہیں لکھیں بلکہ پیسے دے کر منشیوں یا اپنے عزیزوں سے لکھوائی ہیں۔ اس لیے یہ بیگمات کے جذبات نہیں بلکہ اہلِ قلم کی محض انشا پردازی ہے۔ انشائے سرور میں سات خطوط وہ بھی شامل ہیں جو سرور نے بیگمات کی طرف سے واجد علی شاہ کو لکھے تھے۔ عشیر نامی ایک شخص نے بھی ان بیگمات کے لیے خطوط لکھے تھے۔ حد تو یہ تھی کہ ماموں اور باپ نے بھانجی یا بیٹی کی طرف سے واجد علی شاہ کے نام محبت نامے لکھے تھے۔ نور الزماں بیگم ایک خط میں لکھتی ہیں:

"میرے ماموں اور اباجان بعد پانچ برس کے زیارات عتباتِ عالیات اور حج سے مشرف ہو کر آئے ہیں۔ اب میں عشق نامہ اُن سے تحریر کرواتی ہوں[2]۔"

۱۔ رقعات بیگمات، مرتبہ محمد امتیاز علی خاں نجیب، فرخ آباد، ۱۳۲۰ھ، ص ۴۹

۲۔ تاریخ نور۔ قلمی، ص ۴۹، بحوالہ مکتوبات اُردو کا ادبی و تاریخی ارتقا۔

www.paknovels.com

صرف محبوبائیں ہی نہیں بلکہ خود عاشق بھی یہ خدمات دوسرے لوگوں سے لیتے ہیں۔ پروفیسر خواجہ احمد فاروقی لکھتے ہیں:

"ان میں سے کچھ خطوط (ممتاز جہاں نواب اکلیل محل کے نام) واجد علی شاہ نے خود لکھے ہیں اور کچھ انھوں نے ذوالفقار الدولہ سے لکھوائے ہیں جو واجد علی شاہ کی ایک اور بیگم کے حقیقی بھائی ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ انھوں نے اپنی بہن کی سوکن کو اس طرح کی رنگین اور عشق انگیز خطوط کیسے لکھے ہیں، ان خطوط میں معانقۂ جسمانی کا اشتیاق اور پچھلی صحبتوں کا ماتم ہے[۱]۔"

غرض یہ خط بے شرمی، بے حیائی، عیاری اور مکاری کا بہترین نمونہ ہیں اور انسانیت کے نام پر دھبّہ ہیں۔

رجب علی بیگ سرور

سرور کے خطوط میں عام طور سے رنگینیٔ عبارت، مبالغہ آرائی اور کثرتِ مترادفات نہیں لیکن انھیں مقفیٰ عبارت لکھنے کا شوق ہے جس سے کبھی عبارت میں حسن پیدا ہوتا ہے اور کبھی غیر موثر ہو جاتی ہے۔ خط لکھتے ہوئے سرور پورا خیال رکھتے ہیں کہ عبارت دلچسپ، شگفتہ اور پُر لطف ہو۔ اور کبھی جلدی میں خط لکھتے ہیں تو یہ کہہ کر معذرت چاہتے ہیں:

"اس وقت تک وقت ڈاک کا تھا۔ جلدی میں یہ لکھ دیا۔ پھر مفصّل اپنی طبیعت کا حال اور سرگزشت ایذا اٹھانے کی لکھوں گا۔ یہ دو سطریں انتشارِ طبیعت میں لکھی ہیں۔ کوئی چست نقرہ نہ نکلا[۲]۔"

۱۔ مکتوباتِ اُردو کا ادبی و تاریخی ارتقا، ص ۱۱۳

۲۔ رجب علی بیگ سرور، انشائے سرور، طبع پنجم، لکھنؤ، ۱۹۱۶ء، ص ۵۳

www.paknovels.com

ان کے تقریباً تمام خطوط کی عبارت مقفیٰ ہے۔ انھیں اس پر فخر بھی ہے۔ اس لیے انشائے سرور کے ہر صفحے پر "انشائے سرور اُردو مقفیٰ" لکھا گیا ہے۔ سرور کی مکتوب نگاری کی خوبی یہ ہے کہ اس میں انشا پردازی کے وہ جوہر نہیں دکھائے گئے۔ جو عبارت کا عیب بن جاتے ہیں۔ انھوں نے ایک بات کو ایک دفعہ کہا۔ اور بہت اچھی طرح کہا۔ ایسا نہیں کہ ایک ہی بات کو طرح طرح سے کہہ کر بے معنی اور بے اثر کر دیا ہو۔ ان مکاتیب کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اُردو نثر اور مکاتیب کی زبان قدیم انشا پردازی سے اپنا دامن چھڑانے کی کوشش کر رہی ہے۔ لیکن ابھی پوری طرح کامیاب نہیں ہوئی۔ ایک خط ملاحظہ ہو جو انھوں نے متبنٰی بیٹے مرزا احمد علی کو لکھا ہے۔ اس میں عبارت مقفیٰ ہے۔ لیکن غیر ضروری الفاظ و تلمیحات کا استعمال قطعی نہیں۔ جو باتیں کہنے کی ہیں۔ انھیں معمولی سا رنگ دے کر کہا ہے۔

"دوسری تاریخ صفر کی، سہ شنبہ تھا جو خط تمھارا آیا۔ یہ مژدہ سنایا۔ اس کو لے جا کے اپنے ہاتھ سے دینا فوراً جواب لے کے بھیج دینا۔ جو حال تم نے لکھا تھا مجھ کو یقین ہے کہ تم دروغ گو نہیں ہو۔ بیٹا دینا کا یہی رنگ ہے جس پر احسان کرو ایسی باتوں کے منتظر رہو اگر خدا نے چاہا اور منشی صاحب نے بلایا تو فوراً۔ مجھ کو کانپور میں سمجھو۔ دریں ولا نہایت مجبور ہوں۔ ورنہ اس خط سے پہلے پہنچتا۔ بغیر پچاس روپے آ نہیں سکتا۔ مگر جان لڑاؤں گا۔ خدا نے چاہا تو جلد آؤں گا۔ آیندہ جو مرضیٔ خدا۔ بندہ کا اختیار کیا۔ گرمی کی یہ شدت ہے کہ بیان میں زبان پر چھالے ہوتے ہیں۔ زخم جگر آلے ہوتے ہیں۔ مہینے سے زیادہ عرصہ ہوا ایک بوند پانی کی نہیں برسی۔ دن رات بھنتے ہیں۔ سر ڈھنتے ہیں۔ جب تک جاگتے ہیں زبان پر پانی پانی ہے۔ نیند جو آتی ہے وہی زندگانی ہے۔۔۔۔![1]"

۱۔ انشائے سرور، ص ۵۶

www.paknovels.com

خواجہ غلام غوث خاں بے خبر

رجب علی بیگ سرور کے مکاتیب سے اندازہ ہوتا ہے کہ اُردو نثر قدامت سے دامن چھڑا رہی ہے۔ اور سرور قدیم اور جدید کے درمیان ایک کڑی ہیں۔ اس کے برعکس بے خبر کے مکاتیب کا مطالعہ پڑھنے والے کو کسی نتیجے پر پہنچنے نہیں دیتا۔ وہ بیک وقت قدیم بھی ہیں اور جدید بھی۔ ان کے بعض خطوط میں الفاظ کی محض شعبدہ گری ہے اور بعض خطوط کا شمار یقیناً جدید نثر میں ہوتا ہے۔ غلام امام شہید کے دیوان کا بے خبر نے دیباچہ لکھا تھا جس کی ابتدا ان الفاظ سے ہوتی ہے:

"قبلہ! میری شوخی دیکھیے، یوسف کو آئینہ دکھاتا ہوں۔ خورشید کو روشنی کی حکایت سناتا ہوں، گلزار میں پھول لے جاتا ہوں۔ ختن میں مشک تحفہ بھیجتا ہوں۔ دریا کے سامنے روانی کے معنی بیان کر رہا ہوں۔ چاند کے روبرو نور افشانی کا معما حل کرتا ہوں۔ لعل کے روبرو میں رنگ کی دوکان کھولتا ہوں۔ قند کے مواجہ میں شیرینی تولتا ہوں۔ مسیحا سے کہتا ہوں جان بخشی کی روایت سنیے۔ موسیٰ سے تمنا کرتا ہوں کہ ید بیضا کی چمک دیکھیے۔ یعنی حضرت کا دیوان مرتب کر کے آپ کے حضور میں پیش کرتا ہوں[1]۔"

یہ کہا جا سکتا ہے کہ دیباچوں اور تقریظوں میں عام طور پر ایسی عبارت لکھی جاتی تھی لیکن بے خبر نے ایسے مکتوب بھی لکھے ہیں۔ جن میں صرف انشا پردازی کے جوہر دکھائے ہیں۔ کوئی صاحب محب ہیں۔ بے خبر انھیں لکھتے ہیں:

.... خدا کا شکر کرو کہ اس نے تمھیں محبوب صورت مرغوب سیرت حسن شمائل پسندیدہ خصائل فہم رسا ذہن و ذکا عقل سلیم طبیعت مستقیم

۱۔ خواجہ غلام غوث خاں بے خبر، انشائے بے خبر۔ مرتبہ سید مرتضیٰ حسین بلگرامی، علی گڑھ، ۱۹۶۰ء ص ۱۰

www.paknovels.com

علم مفید بخت سعید تقریر کی فصاحت تحریر کی بلاغت اخلاق تام مقبولیت عام صولت ثروت قدرت حکومت نیک نامی کا شہرہ، شاد کامی کا بہرہ عزت کی دولت، دولت کی عزت سب کچھ دیا ہے۔ سویدا کی صورت جگہ ہر ایک دل میں ہے، نور کی طرح مقام آنکھوں کے تل میں ہے۔ جسے دیکھو دامن کی وضع پاؤں پر سر جھکائے ہوئے، جس پر نظر کرو رکاب کی مثال قدم آنکھوں سے لگائے ہوئے، خواص کو یہ تمنا کہ طرہ کے مانند سر پر چڑھائے عوام کی یہ خواہش کہ خاک راہگذار کی شکل سواری کے نیچے پس جائے۔ عطر کے مشابہ جس بزم میں آئے مہک اُٹھے۔ آفتاب کے مثال جس طرف رُخ کیا۔ چمک اٹھی![1]"

اس پورے خط میں صرف مدح سرائی کی گئی ہے۔ یہ نثر میں قصیدہ ہے جس میں صرف کثرت مترادفات کے سہارے ایک ہی بات کہی گئی ہے کہ تم میں دنیا بھر کی خوبیاں ہیں۔ یہ قدیم اسلوب بیان کی مثالیں ہیں۔ اب وہ خط ملاحظہ فرمایئے جو حُسن سادگی، شگفتگی اور روانی و سلاست میں خطوطِ غالب سے لگّا کھاتے ہیں بلکہ جن خطوط میں غالب کا تتبع کیا گیا ہے۔ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ بے خبر خطوطِ غالب کے پہلے مجموعے "عودِ ہندی" کے مرتب ہیں۔ اس لیے ممکن نہیں کہ ان پر شعوری یا غیر شعوری طور پر غالب کا اثر نہ ہوا ہو۔

بے خبر نے ذکا اللہ کے نام ایک خط لکھا ہے۔ اس کا اقتباس ملاحظہ ہو:

"مدتے شد کہ رہِ مہر و وفا مسدود است
نہ کسے میرود آنجا نہ کسے می آید

کیوں مخدوم آپ کو کبھی یہ بھی خیال ہوتا ہے کہ ایک فقیر گوشہ نشیں، درویش عزلت گزیں بے خبر دلِ حزیں نام میرا دعاگوے قدیم الہ آباد

۱- انشائے بے خبر، ص ۲۰
۲- ایضاً، ص ۳۰

www.paknovels.com

میں رہتا ہے۔ کچھ اس کی تو خبر لیں کہ وہ ہے یا کیا ہوا۔"

غالب بے خبر کے نام ایک خط کی ابتدا ان الفاظ سے کرتے ہیں:

"قبلہ! کبھی آپ کو یہ بھی خیال آتا ہے کہ کوئی ہمارا دوست جو غالب کہلاتا ہے۔ وہ کیا کھاتا پیتا ہے اور کیونکر جیتا ہے۔"[1]

ظاہر ہے کہ بے خبر کا خط غالب کے ان الفاظ کا چربہ ہے۔ اکثر خطوط میں بے خبر نے غالب کی پیروی کی ہے۔ غالب کا دعویٰ ہے کہ میں نے مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا ہے اور غالب کا یہ دعویٰ یقیناً درست ہے۔ اگرچہ خود غالب کے مکالمہ نما مراسلوں میں تکلّف اور معمولی سا تصنع ہوتا ہے اور خط پڑھ کر لگتا ہے کہ یہ خط لکھنے میں غالب نے اچھی خاصی محنت کی ہے اور بے خبر جب اس راستے پر آتے ہیں تو بالکل ہی توازن کھو دیتے ہیں اور خط ایک مضحکہ خیز عبارت بن کر رہ جاتی ہے۔ بے خبر کا ایک خط ملاحظہ ہو:

" اجی حضرت! عید ملنے آیا ہوں۔ اٹھیے اور ملیے۔

سخت میخواہم کہ در آغوش تنگ آرم ترا

ہر قدر بہ فشردۂ دل را بے فشارم ترا

آپ فرمائیں گے کہ عید بیچھے ٹرکیسی۔ یہ بات نہیں ہے۔ عید کی نماز بھی رمضان شریف کے بخیر سدھارنے کا صلواۃ الحمد پڑھ کے جو پڑا تو ضعفِ صوم سے کئی دن بے ہوش پڑا رہا۔ پھر جو ہوش آیا تو اسی وقت ادھر کو چلا۔ بہت جلدی کی دوڑتا ہوا آیا ہوں جو آج پہنچا ورنہ اپنا تو ناتوانی سے بقول یادش بخیر بے خبر یہ حال ہے۔

در اول بہار رَوَم گر بسوئے باغ

از ضعف تا رسم بدر آں خزاں رسید

۱۔ غالب، خطوطِ غالب، مرتبہ غلام رسول مہر، طبع سوم، ۱۹۶۲ء، ص ۳۳۲

www.paknovels.com

خیر یہ باتیں تو جانے دیجیے۔ سویاں منگوایئے یا اسے بھی افطاری کی طرح ٹال دیجیے گا۔ معلوم ہوا آپ کچھ بھی نہ منگوائیں گے۔ آپ کو ٹالنا خوب آتا ہے، لایئے عطر و پان ہی عنایت کیجیے۔ میں اب رخصت ہوتا ہوں۔ آپ سے تو یہ بھی امید نہیں ہے کہ بازدید کو تشریف لایئے گا۔ آپ کو راجاؤں سے کہاں فرصت ملتی ہے کہ غریبوں کی طرف توجہ فرمایئے گا۔"[1]

اس خط میں سراسر تکلّف اور تصنع ہے۔ بلکہ یوں لگتا ہے کہ غالب کے کسی خط کی پیروڈی ہے۔ اس سب کے باوجود بے خبر کے ان خطوط کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا جو صاف اور سادہ زبان میں لکھے گئے ہیں۔ اگر بے خبر خواہ مخواہ غالب کا تتبع نہ کرتے تو اردو کے مکاتیبی ادب میں ان کا مقام اور زیادہ اونچا ہوتا۔

غالب

یہ ہے پس منظر جس میں غالب نے اُردو میں خط لکھنا شروع کیا۔ جب غالب نے اس فن کی طرف توجہ کی تو دو واضح رجحان تھے جن کا تفصیلی ذکر کیا جاچکا ہے۔ غالب نے دوسرے رجحان کو اپنایا۔ یعنی انھوں نے سیدھی سادی روزمرہ زبان میں خط لکھے جو مغربی خیالات کے زیرِ اثر اچھی خاصی مقبولیت حاصل کرچکی تھی۔ یعنی فورٹ ولیم کالج، دہلی کالج اور صحافت اور سرکاری و عدالتی ضرورتوں نے جس زبان کو فروغ دیا تھا، غالب نے مکتوب نگاری کے لیے اسی زبان کو اپنایا۔ جدید نثر کی ابتدا غالب سے ہرگز نہیں ہوتی۔ ہاں جدید نثر میں غالب کی حیثیت ایک صاحبِ طرز کی ہے جس نے اپنی جدّتِ طبع اور ذہانت سے فنِ مکتوب نگاری کو عروج پر پہنچایا۔

۱۔ انشائے بے خبر، ص ۱۹

www.paknovels.com

کتابیات

(غالب اور شاہانِ تیموریہ)

آبِ حیات، محمد حسین آزاد
اسبابِ بغاوت ہند، سر سید احمد خاں مرتبہ ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی، اُردو اکیڈمی سندھ کراچی، ۱۹۵۷ء
انتقادیات، نیاز فتح پوری، کراچی ۱۹۵۹ء
اندازے، فراق گورکھپوری، الہ آباد، ۱۹۵۹ء
بہادر شاہ کا مقدمہ، مترجمہ ضیاء الدین برنی (طبع ششم) دہلی ۱۹۴۷ء
بہادر شاہ ظفر اور ان کی شاعری، ڈاکٹر اسلم پرویز (تحقیقی مقالہ، دلّی یونیورسٹی لائبریری)
بہادر شاہ ظفر، خواجہ تہور حسین، دہلی
بین الاقوامی غالب سیمینار، مرتبہ ڈاکٹر یوسف حسین خاں، صد سالہ یادگار غالب کمیٹی، نئی دلّی، ۱۹۶۹ء
پنج آہنگ (مشمولہ کلیاتِ نثرِ غالب) نول کشور لکھنؤ ۱۸۶۸ء
تلاشِ غالب، نثار احمد فاروقی (دہلی ۱۹۶۹ء
تلامذۂ غالب، مالک رام، نکودر، ۱۹۵۷ء
جنگِ آزادی، خورشید مصطفیٰ رضوی، دہلی ۱۹۵۹ء
خدنگ غدر، معین الدین حسن خاں، دہلی ۱۹۷۲ء
خطوطِ غالب، مرتبہ مالک رام، علی گڑھ ۱۹۶۲ء
خطوطِ غالب، مرتبہ غلام رسول مہر، لاہور ۱۹۵۸ء
دستنبو، اسد اللہ خاں غالب، دلّی ۱۹۶۹ء

www.paknovels.com

دستور العمل اودھ (قلمی) رضا لائبریری، رام پور
دہلی کا آخری سانس، مرتبہ خواجہ حسن نظامی (طبع پنجم) دلّی ۱۹۳۵ء
دیوانِ ذوق، شیخ ابراہیم ذوق، آزاد بک ڈپو دہلی، (سنہ نہیں دیا)
دیوانِ غالب، مرتبہ امتیاز علی عرشی، علی گڑھ ۱۹۵۸ء
ذکرِ غالب، مالک رام (طبع چہارم) دہلی، ۱۹۶۴ء
ذوق سوانح اور انتقاد، تنویر احمد علوی، لاہور، ۱۹۶۳ء
طبقات الشعرائے ہند، ایف فلن و مولوی کریم الدین، مرتبہ عطاء الرحمن، معاصر، پٹنہ
جلد ۱۹، ۱۹۶۴ء
عمدہ منتخبہ، سرور، مرتبہ خواجہ احمد فاروقی، دہلی، ۱۹۶۱ء
عیار الشعرا، خوب چند ذکا، (قلمی) مملوکہ کتب خانہ انجمن ترقی اُردو ہند دہلی
غالب کی نادر تحریریں، مرتبہ خلیق انجم، دہلی ۱۹۶۱ء
قلعہ معلّی کی جھلکیاں، عرش تیموری، دہلی ۱۹۳۷ء
کلیاتِ غالب (نظم فارسی) نولکشور لکھنؤ ۱۸۶۳ء
کلیاتِ نثر غالب، غالب، (مطبع نولکشور، ۱۸۷۱ء)
کلیاتِ ظفر، پیش لفظ عمر فیضی، لاہور، ۱۹۶۸ء
گلشنِ بے خار، نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ، لکھنؤ، ۱۸۷۴ء
متفرقاتِ غالب، مرتبہ سید مسعود حسن رضوی، رام پور ۱۹۴۷ء
مکاتیبِ غالب، مرتبہ امتیاز علی عرشی (طبع ششم) رام پور ۱۹۴۹ء
مغل اور اُردو، نواب نصیر حسین خیال، کلکتہ، ص ۱۵۷
یادگارِ شعرا، اسپرنگر، مترجمہ طفیل احمد، الہ آباد، ۱۹۴۳ء
یادگارِ غالب از الطاف حسین حالی۔ مرتبہ مالک رام۔ دلّی ۱۹۷۱ء
۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ، مترجمہ خلیق احمد نظامی۔ دہلی ۱۹۵۸ء

NATIONAL ARCHIVES

FOREIGN DEPARTMENT

www.paknovels.com

(1) POLITICAL (S. NOS 254-261 N.A.I)

(2) 30, OCT, 1857 (No. 86)

(3) 10 Dec 1858 (S. Nos. 52-125)

MUTINY PAPERS : COLLECTION NO. 102 (FILE NO 103. N.A.I.

HYDERABAD LAW REPORTER — REPUBLIC

LIST NATIONAL ECONOMY

EDUCATIONAL RECONSTRUCTION IN INDIA.

THE DYNAMIC UNIVERSITY

DIE BORACHEFT DES MAHATMA GANDHI

P. SPEXRES : TWILIGHT OF THE MUGHALS. CAMBRIDGE. 1951.

آجکل، دہلی : فروری ۱۹۴۷ء

احسن الاخبار، بمبئی : ۲۵ جون ۱۸۴۷ء

دہلی اردو اخبار : ۲۸ مارچ ۱۸۵۲ء؛ فروری ۱۸۵۳ء؛ ۱۶ مارچ ۱۸۵۳ء؛ ۳۰ مارچ ۱۸۵۳ء؛ ۱۷ اپریل ۱۸۵۳ء؛ ۲۴ اپریل ۱۸۵۳ء؛ ۸ مئی ۱۸۵۳ء؛ ۱۱ مئی ۱۸۵۳ء؛ ۲۲ مئی ۱۸۵۳ء؛ ۱۹ جون ۱۸۵۳ء؛ ۲۸ اگست ۱۸۵۳ء؛ ۹ اکتوبر ۱۸۵۳ء؛ ۴ ستمبر ۱۸۵۳ء؛ ۱۸ نومبر ۱۸۵۴ء

سراج الاخبار : ۹، ۱۶ مئی ۱۸۵۷ء

شاعر، بمبئی : غالب نمبر ۱۹۶۹ء

صحیفہ، لاہور : غالب نمبر (۱) ۱۹۶۹ء

معارف، اعظم گڑھ : اپریل ۱۹۲۲ء؛ مئی ۱۹۲۲ء؛ فروری ۱۹۵۸ء؛ اگست ۱۹۵۸ء؛ مئی ۱۹۵۹ء

نقوش، لاہور : مارچ ۱۹۶۳ء

نوائے ادب، بمبئی : جولائی ۱۹۵۵ء؛ اپریل ۱۹۵۸ء؛ جولائی ۱۹۵۸ء؛ اپریل ۱۹۵۹ء

www.paknovels.com

اشاریہ

(غالب اور شاہانِ تیموریہ)

www.paknovels.com

www.paknovels.com

www.paknovels.com

www.paknovels.com

www.paknovels.com

www.paknovels.com

www.paknovels.com

www.paknovels.com

کتابیات

(اُردو مکتوب نگاری کا آغاز اور غالب)

ادبی خطوط غالب، مرزا محمد عسکری، نظامی پریس، لکھنو، ۱۹۲۹ء

اردو خطوط، شمس الرحمٰن، کتابی دنیا، دہلی

اردوئے معلی، غالب، حصہ اول، اکمل المطابع، دہلی، ۱۸۶۹ء

اردوئے معلی، غالب، حصہ دوم، مطبع مجتبائی، میرٹھ، ۱۸۹۹ء

آثارِ غالب، شیخ محمد اکرام، حصہ اول، تاج آفس، بمبئی

اطرافِ غالب، سید عبداللہ، لاہور

انتخاب خطوط غالب، اُردو اکیڈمی، کراچی، ۱۹۶۰ء

انشائے اُردو، مرتضیٰ حسین فاضل، لاہور، ۱۹۶۲ء

انشائے بے خبر، غلام غوث خاں بے خبر،

تاریخ ادب اُردو، رام بابو سکسینہ، نولکشور پریس، لکھنؤ

تنقیدیں، اویس احمد، اُردو پبلشنگ ہاؤس، الہ آباد

خطوط غالب، اول و دوم، غلام رسول مہر، علمی پرنٹنگ پریس، لاہور، ۱۹۵۲ء

خطوط غالب، جلد اول، مولوی مہیش پرشاد، ہندستانی اکیڈمی، الہ آباد، ۱۹۴۱ء

خطوط غالب، ترتیب جدید، مالک رام، انجمن ترقی اُردو ہند علی گڑھ، ۱۹۶۲ء

رقعات غالب، عبدالرحمٰن شوق، دین محمد پرنٹنگ پریس، لاہور، ۱۹۳۷ء

عود ہندی، غالب، مطبع مجتبائی، میرٹھ، ۱۸۶۸ء

غالب کی نادر تحریریں، مرتبہ خلیق انجم، دہلی، ۱۹۶۱ء

غالب نامہ، شیخ محمد اکرام، لکھنؤ

www.paknovels.com

غالب: فکر و فن، شوکت سبزواری، انجمن ترقی اُردو، کراچی
غالب اور مطالعۂ غالب، عبادت بریلوی، دہلی
غالب نام آورم، نادم سیتاپوری، لکھنؤ
قلعۂ معلّٰی کی جھلکیاں، عرش تیموری، دہلی، ۱۹۳۷ء
مرقعِ ادب، صفدر مرزا پوری
مکاتیب الغالب، احسن مارہروی، علی گڑھ
مکاتیب غالب، امتیاز علی عرشی، مطبع قیوم، رام پور، ۱۹۳۷ء
میر امن سے عبدالحق تک، سید عبداللہ، لاہور
یادگارِ غالب، الطاف حسین حالی مرتبہ مالک رام، دلّی، ۱۹۷۱ء

آجکل دہلی، فروری، ۱۹۴۷، ۱۹۵۵، ۱۹۶۳، ۱۹۶۴، ۱۹۶۵، ۱۹۶۷ء
اُردو، سہ ماہی، عبدالحق، اورنگ آباد، ۱۹۳۴ء
اُردو ادب، غالب نمبر، سہ ماہی، آل احمد سرور، ۱۹۶۹ء
سب رس، غالب نمبر، حیدر آباد دکن، ۱۹۶۹ء
زمانہ، کانپور، ۱۹۴۹ء
صحیفہ، غالب نمبر، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۹ء
علی گڑھ میگزین، غالب نمبر، ۱۹۶۹ء
علم و فن، دہلی۔
نقوش، لاہور، مکاتیب نمبر، ۱۹۵۷ء
نگار، لکھنؤ، ۱۹۵۰ء

www.paknovels.com

اشاریہ

(اُردو مکتوب نگاری کا آغاز اور غالبؔ)

www.paknovels.com

www.paknovels.com

www.paknovels.com

www.paknovels.com

مکتبہ جامعہ کی قابلِ فخر پیش کش

نگارشات

پروفیسر محمد مجیب

پروفیسر محمد مجیب کی اُردو نگارشات تقریباً نصف صدی پر پھیلی ہوئی ہیں اور ان کے موضوعات کا میدان اتنا ہی وسیع ہے جتنی کہ خود زندگی۔ یہ مجیب صاحب کے اُن مضامین کا انتخاب ہے جو آپ نے ۱۹۲۷ء سے ۱۹۴۷ء تک رسالہ "جامعہ" کے لیے لکھے تھے۔

مجیب صاحب کی ادبی خدمات کا اعتراف اُردو کے تمام حلقوں نے کیا ہے۔ مکتبہ جامعہ بھی اس پُرخلوص اعتراف میں شریک ہے اور اسی کے ایک ادنیٰ اظہار کے طور پر یہ مجموعۂ مضامین ان کی خدمت میں پیش کرنے کا شرف حاصل کر رہا ہے۔

قیمت -/۱۶

(فوٹو آفسٹ کے ذریعے شایع کی گئی)

www.paknovels.com

مکتبۂ جامعہ لمیٹڈ کی ایک اہم کتاب

جانے والوں کی یاد آتی ہے

صالحہ عابد حسین

اس کتاب میں بزرگ ہستیوں پر بھی مضامین ہیں اور محبوب دوستوں پر بھی۔ ان میں مولانا حالی، خواجہ سجاد حسین، مولانا اسلم جیراجپوری، مہاتما گاندھی، جواہر لعل نہرو، مہدی نواز جنگ، ڈاکٹر ذاکر حسین، خواجہ محمد صادق، خواجہ غلام السیّدین، شفیق قدوائی، جیسی مشہور و معروف شخصیتیں بھی ہیں اور مشتاق فاطمہ، عزیز سیدین، قدسیہ زیدی، صدیقہ قدوائی، خواجہ اظہر عباس اور مختار مہدی جیسی محبوب ہستیاں بھی۔

صالحہ عابد حسین صاحبہ کے جادو نگار قلم نے بڑے ہی دل کش انداز میں ان حضرات کی سیرت اور شخصیت کو اُجاگر کیا ہے۔ ایک گراں قدر تحفہ۔

قیمت

اٹھارہ روپے

KASHMIR UNIVERSITY
Iqbal Library
Acc. No ...182028
Dated 5-8-80

www.paknovels.com